صدر الکلام

فی

عقائد الاسلام

تصنیف

ماہرِ علومِ شریعت، واقفِ رموزِ طریقت، رازدانِ اسرارِ حقیقت

حضرت معظم قاضی محمد صدر الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

صدر الکلام
فی
عقائد الاسلام
تصنیف
ماہر علومِ شریعت، واقفِ رموزِ طریقت، رازدانِ اسرارِ حقیقت
حضرت معظم قاضی محمد صدر الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

۷۸۶

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ○

انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اس کو علم نہ تھا۔

صدر الکلام

فی

عقائدِ الاسلام

تصنیف

ماہرِ علومِ شریعت، واقفِ رموزِ طریقت، رازدانِ اسرارِ حقیقت

حضرت معظم قاضی محمد صدر الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ترتیب جدید و اضافۂ حواشی

حضرت علامہ قاضی عبد الدائم دائمؔ مدظلہ العالی

خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ، ہری پور ہزارہ

۶
ابتدائیہ
قاضی عبدالدائم دائم
۱۳
مقدمہ
محمد شفیع صابر
۱۸
تعارف
مولانا محمد اسرائیل
ترتیب ابواب
پہلا باب
اَلْاِیْمَانُ بِاللّٰہِ تَعَالٰی
۲۷
دوسرا باب
اَلْاِیْمَانُ بِمَلٰئِکَۃِ اللّٰہ
۴۳
تیسرا باب
اَلْاِیْمَانُ بِکُتُبِ اللّٰہ
۸۹
چوتھا باب
اَلْاِیْمَانُ بِرُسُلِ اللّٰہ
۱۰۳
پانچواں باب
اَلْاِیْمَانُ بِالْیَوْمِ الْاٰخِر
۱۴۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وَمَنْ يَّكْفُرْ
بِاللّٰهِ
وَ
مَلٰٓئِكَتِهٖ
وَ
كُتُبِهٖ
وَ
رُسُلِهٖ
وَ
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ
فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا
قرآن مجید، پارہ ۵، سورۃ النساء، آیت ۱۳۶

ترجمہ

اور جو انکار کرے

اللہ (رب العزت) کا

اور

اس کے فرشتوں کا

اور

اس کی کتابوں کا

اور

اس کے رسولوں کا

اور

آخرت کے دن کا

تو وہ یقیناً دور دراز کی گمراہی میں مبتلا ہوگیا۔

اس کتاب میں انہی پانچ ایمانیات کو نہایت بصیرت افروز اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر چیز کو عقل کے معیار پر جانچنے والوں کو سمجھانے کیلئے کتاب کی بنیاد خالص عقلی دلائل پر رکھی گئی ہے؛ البتہ بعض مقامات پر تائید کے لئے قرآن و سنت سے بھی دلیلیں لائی گئی ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

قاضی عبدالدائم دائمؔ

کہا جاتا ہے کہ کافی عرصہ پہلے ایک مولوی صاحب ہوا کرتے تھے جو بہت بڑے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ خاصے آسودہ حال بھی تھے۔ ایک دن وہ اپنی حویلی سے ملحق باغ میں خوبصورت حوض کے کنارے بیٹھے کسی کتاب کے مطالعہ میں مستغرق تھے۔ پاس مزید کتابیں بھی قرینے سے رکھی ہوئی تھیں کہ اچانک وہاں ایک درویش چلا آیا جس کے بال بکھرے ہوئے اور بدن گردآلود تھا۔ مولوی صاحب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے وہاں رکھی ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا---''مولوی! ایں چیست؟''
(مولوی! یہ کیا چیزیں ہیں؟)

مولوی صاحب نے سوچا کہ یہ کوئی ان پڑھ آدمی ہے، جو کتابوں کی اہمیت سے ناواقف ہے، اس کو میں کیا بتاؤں کہ یہ کیا چیزیں ہیں، اس لئے بیزاری سے بولے

''ایں آنست کہ تو نمے دانی!'' (یہ ایسی چیزیں ہیں کہ تم ان کے بارے

میں کچھ نہیں جانتے)

یہ سنتے ہی درویش نے وہ ساری کتابیں اٹھائیں اور حوض میں پھینک دیں۔ اس زمانے میں چھاپہ خانے تو ہوتے نہیں تھے کہ ایک کتاب ضائع ہوگئی تو دوسری منگالی؛ بلکہ روشنائی میں قلم ڈبو کر ہاتھ سے کتابیں لکھی جاتی تھیں جو بہت مشکل سے دستیاب ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے مولوی صاحب کو درویش کی اس حرکت پر حد سے زیادہ غصہ آیا اور غیض وغضب، حسرت وافسوس اور غم واندوہ کی ملی جلی کیفیت سے ان کی حالت عجیب ہوگئی۔

درویش نے مولوی صاحب کو یوں پریشان اور افسردہ وغمگین دیکھا تو حوض میں ہاتھ ڈالا اور تمام کتابیں نکال کر باہر رکھ دیں۔ مولوی صاحب نے متاعِ گم گشتہ یوں بازیاب ہوتے دیکھی تو بے تابانہ کتابوں کی طرف لپکے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کتابیں پہلے کی طرح خشک تھیں اور ان پر ذرہ برابر نمی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ انتہائی تعجب سے درویش کی طرف دیکھا اور کہا---"بابا! ایں چیست؟" (بابا! یہ کیا تماشہ ہے؟)

درویش نے کہا---"مولوی! ایں آنست کہ تو نمے دانی!" (مولوی! یہ وہ چیز ہے کہ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔)

یہ نظارہ دیکھ کر مولوی صاحب کی توجہ کتابوں کی طرف سے یکسر ہٹ گئی اور وہ اس درویش کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ہمیشہ کے لئے اس کے دامن سے وابستہ ہوگئے۔

پہچانا آپ نے کہ یہ مولوی صاحب کون تھے اور وہ درویش کون تھا---؟

مولوی صاحب وہ فاضل اجل تھے جنہیں اب ساری دنیا مولانا روم

کے نام سے جانتی ہے اور اقبال جیسا فلسفی و جدید تعلیم یافتہ انسان انہیں اپنا پیرو مرشد تسلیم کرتا ہے

پیرِ رومی پیرِ ما روشن ضمیر کاروانِ عشق و مستی را امیر

(پیرِ رومی میرا پیر ہے، جو روشن ضمیر ہے اور عشق و مستی کے قافلے کا امیر ہے)

اور کاروان عشق و مستی کے اس امیر کے دل میں عشق الٰہی کا پہلا شعلہ فروزاں کرنے والا درویش، وہ مردِ کامل تھا جسے شاہ شمس تبریزی کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔

اس سے وابستگی اور اس کی خدمت گذاری کا مولانا کو جو صلہ ملا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے خود ہی فرماتے ہیں

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم تا غلامِ شمس تبریزے نہ شد

(مولوی اس وقت تک مولائے روم نہیں بنا جب تک کسی شمس تبریزی کا غلام نہیں بن گیا)

اور جب شمس تبریزی کی غلامی کے صدقے ان کی توجہ محبوب حقیقی کی جانب مستقیم ہوئی اور عشق الٰہی کی لذت سے دل آشنا ہوا تو وہ ہر کسی کو یہ نصیحت کرنے لگے کہ

صد کتاب و صد ورق در نار کن روئے دل را جانب دلدار کن

(سو کتابیں اور سو ورق آگ میں جھونک دو اور دل کے چہرے کو دلدار حقیقی (جل شانہ) کی طرف پھیرلو)

مولانا نے تو آگ میں جھونکنے کی بات بطور محاورہ کہی تھی مگر مصنف عقائد الاسلام پر ایک زمانے میں ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ آپ نے اس پر

سیقۂ عمل کر ڈالا --- اور وہ بھی کسی درویش سے ملاقات کے بعد نہیں ؛ بلکہ الشیخ الا کبر کی ایک کتاب سے متاثر ہو کر!!

جی ہاں، یہ عجیب واقعہ آپ کی سوانح ''حیات صدریہ'' میں یوں مرقوم ہے کہ جب علم ظاہر کی ہر چوٹی سر کر لینے کے بعد آپ ہندوستان سے واپس اپنے گاؤں ''درویش'' تشریف لائے تو

''تدریس، خطابت اور افتاء کا کام شروع کیا۔ آپ کی علمی قابلیت کا جلد ہی شہرہ ہو گیا اور دور دراز سے طلباء آ کر آپ سے علم حاصل کرنے لگے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ آپ ہری پور کی چوک والی جامع مسجد میں خطابت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ علاقے سے جو استفتاء آتے، ان کے جواب لکھتے، لوگوں کے تنازعات کا تصفیہ کرتے اور ان تمام مصروفیات کے باوجود جو وقت بچ جاتا اس میں تصنیف و تالیف کی طرف توجہ فرماتے۔ چنانچہ اس دور میں آپ نے متعدد کتابوں کی شرحیں لکھیں اور حواشی چڑھائے۔ بعض موضوعات پر مستقل کتابیں بھی تصنیف فرمائیں، مگر افسوس کہ وہ بیش بہا علمی تحقیقات جو آپ کی شب و روز محنت اور مسلسل غور و فکر کا نتیجہ تھیں، آپ نے اپنے ہاتھوں سے نذرِ آتش کر دیں۔

آپ نے خود بیان فرمایا کہ اس زمانے میں، مَیں نے حضرت شیخ ابن عربی کی شہرہ آفاق کتاب ''فتوحاتِ مکیہ'' کا مطالعہ شروع کیا اور جب اس کے انتہائی بلند پایہ مطالب سے آگاہ ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ درحقیقت علم یہ ہے اور مَیں آج تک جو کچھ پڑھتا پڑھاتا رہا ہوں، وہ محض تضییعِ اوقات تھی۔ چنانچہ میری طبیعت علمِ ظاہر سے کچھ بیزار سی ہو گئی۔ اسی زمانے میں مولائے رومؒ کا یہ شعر نظروں سے گذرا

صد کتاب وصد ورق در نار کُن　　　روئے دِل را جانبِ دلدار کُن

اس شعر نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مَیں نے اپنی تمام تصنیفات کو اکٹھا کر کے آگ لگادی۔

آپ کی نہایت بلند پایہ تصنیف ''صدر الکلام فی عقائد الاسلام'' بھی اسی زمانے کی یادگار ہے جو اتفاقاً نذرِ آتش ہونے سے بچ گئی تھی۔''

حیات صدریہ، ص ۸۷، ۸۸

بچ تو گئی مگر آپ کی طبیعت چونکہ ظاہری علم سے اچاٹ ہوگئی تھی اس لئے کافی عرصے تک اس کی طباعت کا آپ کو خیال ہی نہیں آیا۔ بعد میں جب آپ نے علم باطن میں بھی کمال حاصل کرلیا اور آپ کے ساتھ متعدد اہل علم وفضل وابستہ ہو گئے تو ان کے اصرار پر ڈھونڈ ڈھانڈھ کر کتاب کا مسودہ نکالا گیا جو کافی کرم خوردہ ہو چکا تھا، یعنی اس کو کیڑا لگ چکا تھا اور متعدد مقامات کھائے جا چکے تھے۔ چنانچہ آپ کی ہدایت و رہنمائی میں مولانا محمد اسرائیل مرحوم نے از سرِ نو اس کا مسودہ لکھا۔ مولانا اسرائیل صاحب عربی، فارسی، اردو اور پشتو، چار زبانوں کے ماہر تھے اور ان دنوں پشاور یونیورسٹی میں فاضلِ السنہ شرقیہ کی پوسٹ پر کام کر رہے تھے۔ مسودہ تو انہوں نے بہت محنت سے مرتب کیا تھا مگر افسوس کہ کتابت کے لئے کوئی اچھا کاتب تلاش نہ کر سکے۔ علاوہ ازیں انہیں عمدہ ترتیب وطباعت کے تقاضوں سے بھی غالباً پوری طرح آگاہی نہ تھی، اس لئے کتاب جب چھپ کر آئی تو اس میں کہیں پیرابندی تھی، نہ کاموں، ڈیشوں اور بریکٹوں کو کام میں لایا گیا تھا۔ کوئی توضیحی نوٹ تھا، نہ حاشیہ۔ مشکل الفاظ کی تسہیل کا کوئی اہتمام تھا، نہ تخریج کا۔ اس کے باوجود اہل علم حضرات نے بلند پایہ طرز استدلال کی وجہ سے اس کو

بہت پسند کیا مگر عام قارئین کو اکثر مقامات سمجھ نہیں آتے تھے اس لئے وہ صحیح طور پر مستفید نہیں ہو سکتے تھے۔

مجھے کافی عرصے سے خواہش تھی کہ اس کتاب کی اشاعت اس کے شایانِ شان ہونی چاہئے اور مشکل اصطلاحی الفاظ کے انگریزی متبادل بھی لکھنے چاہئیں تا کہ ایک انگریزی خوان صاحب علم بھی اس کو بخوبی سمجھ سکے۔ علاوہ ازیں حواشی اور توضیحات وغیرہ کا بھی اضافہ ہونا چاہئے تا کہ عام پڑھا لکھا قاری بھی پوری طرح لطف اندوز ہو سکے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو صاحبِ کتاب کے خلیفہ مجاز محترم قاضی مسعود الحسن آراضوی مرحوم سے گذارش کی گئی کہ آپ کا خط بہت عمدہ ہے اس لئے براہ مہربانی اس کتاب کو ازسرِ نو لکھ دیجئے تا کہ کتابت میں آسانی رہے۔ انہوں نے بخوشی یہ ذمہ داری قبول کر لی اور نہایت واضح اور صاف خط میں ایک نیا مسودہ تیار کر دیا۔ انگریزی متبادلات کی تلاش کا کام پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد سلیم صاحب، ملتان، اور لیکچرار حافظ محمد ابرار صاحب، اسلام آباد، کے سپرد کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اصطلاحی الفاظ کے صحیح متبادل ڈھونڈنا ایک مشکل اور پیچیدہ کام تھا مگر دونوں اہل علم نے انٹرنیٹ اور ڈکشنریوں کا معائنہ ومطالعہ کر کے اور منطق وفلسفہ جاننے والے انگریزی زبان کے ماہرین سے تبادلۂ خیال کر کے بالآخر ہر علمی اصطلاح کا حقیقی متبادل متعین کر لیا۔ حواشی اور توضیحات کا بار میرے ذمہ ڈالا گیا اور مجھے اس میں کس حد تک کامیابی ہوئی---؟ اس کا صحیح اندازہ تو قارئین کی آرا سے ہی ہو سکے گا؛ تاہم اپنے طور پر پوری کوشش کی ہے کہ توضیح وتشریح میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ قاضی سیف الدین صاحب نے آیات واحادیث کی تخریج کی ہے اور محمد بشیر صاحب کو خوبصورت

انداز میں کمپوزنگ کی سعادت حاصل ہوئی ہے؛ جبکہ عزیزم قاضی عابد الدائم عابدؔ نے نہایت باریک بینی سے پروف ریڈنگ کی ہے تاکہ کتاب میں کوئی غلطی نہ رہنے پائے۔

ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد بالآخر یہ عظیم الشان اور رفیع القدر کتاب چھپ کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے۔ مطالعہ کے بعد اپنی قیمتی آراء سے ضرور آگاہ فرمایئے!

طبع اوّل کے وقت جناب محمد شفیع صابر صاحب نے مقدمہ اور مولانا محمد اسرائیل صاحب نے تعارف لکھا تھا۔ اب یہ دونوں حضرات خلد آشیاں ہو چکے ہیں مگر ہم نے ان کی تحریروں کو جوں کا توں رہنے دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نکتہ دان و حقیقت شناس مصنفِ کتاب سمیت سب مرحومین کو ان کی مخلصانہ کاوشوں کا اجر عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

و صلی اللہ علی سیدنا محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین

والسلام

قاضی عبدالدائم دائمؔ

فروری 2010ء

❁❁❁

مُقَدِّمَہ

علامہ محمد شفیع صابر مرحوم، رکن موتمر عالم اسلامی

اللہ تبارک وتعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے اپنی رحمتِ کاملہ سے نبی اکرم جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کو اپنے بندوں کی رہنمائی کے لئے اسلام ایسا دین اکمل دے کر دنیا میں مبعوث فرمایا اور قیامت تک بنی نوع انسان کی ہدایت کا سامان کر دیا۔

اسلام ایک ایسی ابدی حقیقت ہے، جسے جب بھی، جہاں بھی اور جس طرح بھی پرکھا جائے اس کے سچا ہونے میں کوئی شبہ ہو نہیں سکتا؛ البتہ تاریخ کے ہر دور میں پرکھ کے معیار اور تقاضے جدا جدا ہوتے ہیں۔ کبھی صحابہ کرامؓ نے باطل کی قوتوں سے جہاد کر کے اسلام کی حقانیت پر شہادت دی، کبھی مسلمان فلاسفہ و متکلمین نے عقلی دلائل سے اسلامی عقائد کی سچائی کو واضح کیا، تو کبھی صوفیائے کرام نے روحانی اور اشراقی قوتوں سے مشرکانہ اور ملحدانہ خیالات ونظریات کا رد کیا اور دین حق اور علوم وحی ونبوت کی نشر واشاعت کا مقدس فریضہ انجام دیا۔

زیر نظر کتاب ''صدر الکلام فی عقائد الاسلام'' بھی اشاعت دین کے سلسلے میں ایک محققانہ کوشش ہے، کتاب کے مصنف قطب زمان، قدوۃ السالکین، اعلیٰ

حضرت الحاج قاضی محمد صدر الدین صاحب مد ظلہم العالی نہ صرف ایک صاحب اجتہاد فقیہہ، وسیع المطالعہ عالم، ذہین اور طباع فلسفی و متکلم اور فلسفۂ اخلاق کے ماہر ہیں؛ بلکہ اس دور کے نہایت عالی مقام صاحب دل بزرگ بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب اپنی جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے خصوصی اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کو رئیس المحققین، امام المتکلمین غزالیؒ کے ان الفاظ کی روشنی میں پرکھنا اور بھی مناسب رہے گا کہ...... ''صوفیاء ہی اللہ کے راستے کے سالک ہیں، ان کی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں۔ اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی ان کی سیرت و اخلاق سے بہتر نمونہ لانا چاہے تو ممکن نہیں...... ان کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں جس سے روشنی حاصل کی جائے۔''

یہ کتاب اسی حکیمانہ فراست اور مؤمنانہ بصیرت کا مظہر ہے اور ایسے دور میں تصنیف ہوئی ہے جب اس کی انتہائی ضرورت تھی۔

پچھلے 100 سو سال عالم اسلام اور خصوصاً برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں پر بڑے کٹھن گذرے ہیں، یہ وہ وقت تھا جب مسلمان نہ صرف اہل یورپ کی شاطرانہ چالوں اور فوجی حملوں کا نشانہ بن کر سیاسی اقتدار سے محروم ہو گئے؛ بلکہ تہذیبی، تمدنی اور مذہبی محاذوں پر بھی مسلمانوں پر وہ پے در پے حملے ہوئے کہ توبہ ہی بھلی۔ ہر شعبۂ زندگی میں مسلمانوں کو وہ معرکہ درپیش تھا کہ پچھلی صدی کو تصادم اور بحث و مناظرہ کی صدی کہتے ہی بن پڑتی ہے۔ ہندوستان میں مذہبی تصادم کی جدید تحریکوں کے اولین علمبردار تو عیسائی مشنری تھے جو اپنے مخصوص مقاصد کے تحت اسلام پر الزامات عائد

کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتے تھے، لیکن انہیں دیکھ کر ہندوؤں، آریاؤں اور دوسرے مشرکوں کو بھی کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اسی طرح ملحدانہ اور دہریہ خیالات رکھنے والوں کی ایک کافی تعداد اپنے ناپاک عزائم کا برملا اظہار کرنے لگی اور برہمو سماج قسم کے گروہ بھی یہ دعوے لے کر اٹھے کہ تمام مذاہب اصلاً ایک ہیں اور ان کا مقصد صرف معاشرتی اصلاح ہے۔ اس نام نہاد ''مذہبی آزادی'' کی آڑ میں ہر طرف سے اسلامی عقائد پر الزامات کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ مغربی اقوام کی سیاسی اور مادی ترقیات سے مرعوب ہو کر اور انگریز کی لادینی تعلیم کے زیر اثر خود مسلمانوں میں بھی ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو مذہب کی الہامی بنیادوں کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے لگا، یہ دور بڑی افراتفری کا دور تھا اور اگر مسلمان علمائے حق اور صوفیائے کرام بروقت ان فتنوں کی روک تھام نہ کرتے تو خدا جانے اسلام پر کیا بیت جاتی---!

اللہ کریم ان مخلص اور دردمند زعماء کو اجر عظیم دے جنہوں نے نہایت بے سروسامانی کے عالم میں کسی مشکل ومصیبت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہر دشمن اسلام طاقت کا مجاہدانہ وار مقابلہ کیا اور اپنی مساعی جمیلہ سے اسلام کے خلاف ہر سازش کو ناکام بنادیا۔

زیر نظر کتاب بھی ایسے ہی معترضین کو مدلل اور مسکت جواب دینے کے لئے آج سے پچپن 55 برس (اب تقریباً پچاسی 85 برس) پہلے اس وقت لکھی گئی تھی جب فاضل مصنف حیدرآباد دکن میں قیام فرما تھے؛ تاہم اس کی افادیت اور ضرورت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی بوقت تالیف تھی۔ کتاب میں اسلامی عقائد--- مثلاً وجود باری تعالیٰ، توحید، ضرورتِ رسالت اور اثبات حشر ونشر وغیرہ پر عقلی دلائل دے کر ان کی

حقانیت اور حکمت واضح کی گئی ہے۔ یوں تو اسلامی تعلیمات کو سمجھنے میں کوئی پیچیدگی نہیں کیونکہ اسلام کی بنیاد فطرت کے عالمگیر اصولوں پر ہے اور ہر شخص کا ضمیر اور وجدان اسلامی اصولوں کی سچائی کا قائل ہے؛ تاہم ان لوگوں کے لئے جو ہر بات کا فلسفیانہ اور منطقیانہ جواب چاہتے ہیں اور دین میں تعقل، تفکر، مشاہدے اور تحقیق کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، یہ کتاب روشنی کا ایک ایسا مینار ہے جو ان کی مکمل راہنمائی کے لئے کافی ہے۔

کتاب میں مشکل مسائل کو بڑے سادہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے مثلاً یہ کہ ''روحانیت کا وجود عقلاً قابلِ تسلیم ہے'' (ص ۵۰) ''اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور علم و تصرف کے لحاظ سے ہر جگہ موجود ہے'' (ص ۲۸) اور رسالت کی ضرورت اس لئے ہے کہ ''اگر عقل معرفتِ الٰہی کے لئے کافی ہوتی تو سب عقلاء معیار عقل سے حق معلوم کر کے متفق الرائے ہو جاتے'' (ص ۵۸) نیز انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ متعین کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ''انسان کا شرفِ اصلی باطنی سطح کی طہارت و تہذیب پر ہے۔'' علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی زندگی کی تعبیر یوں کی ہے۔

تجھے بتاؤں مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

گرامی مرتبت مصنف بھی مسلمان کو خالق کائنات جل جلالہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی شعار سے حقیقی عشق (کمالِ جنوں) پیدا کرنے کی تلقین فرماتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ تعقل و تفکر (نہایت اندیشہ) سے کام لے کر ایمان کو پختہ تر اور محکم تر بنانے پر زور دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''عقائد میں ظنی دلیل سے کام نہیں لیا جا سکتا، اس کے لئے یقینی دلیل درکار ہوتی ہے جو قرآنی نص اور متواتر احادیث ہی ہو سکتی ہیں

(ص ٦٦)۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہم سب کو سچا مسلمان بننے کی توفیق عطا فرمائے اور اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں حضرت معظم (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کی مساعی حسنہ کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلام عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْن.

احقر
محمد شفیع صابر
پشاور صدر (١٢ ربیع الاول ١٣٩٥ھ)

❀❀❀

تعارف

مولینا محمد اسرائیل مرحوم، ماہر السنہ شرقیہ، پشاور یونیورسٹی

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَفٰی وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِالْوَرٰی وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ مَادَامَتِ الْاَرْضُ وَالسَّمٰوٰتُ الْعُلٰی. اَمَّا بَعْد

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے کمال شفقت ومحبت سے مخلوق کی رہنمائی کے لئے انبیائے کرام اور مرسلین عظام علیھم الصلوٰۃ والسلام و علٰی افضلھم افضلھا واز کٰھا کو مبعوث فرمایا، خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو بھیج کر نوع انسان کو اسلام کی کامل واکمل تعلیمات سے بہرہ مند کیا، اور پھر دین حق کی حفاظت اور تبلیغ واشاعت کے لئے امت محمدیہ میں ہر زمان ومکان میں ایسے برگزیدہ اور پاکیزہ علماء اور اولیاء رحمہم اللہ کو متعین فرمایا، جن کی ساری زندگی دین محمدیؐ کی نشرو اشاعت اور عامۃ المسلمین کی ہدایت کے لئے وقف رہی۔

اسی سلسلۂ نورانی کے ایک فرد فرید، جامع علوم شریعت وطریقت، واقفِ اسرار حقیقت ومعرفت علامۂ اجل وفاضل بے بدل، اعلیٰ حضرت الحاج قاضی محمد صدرالدین صاحب دامت فیوضاتہم کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے علاقے میں احیائے شریعت حقہ وسنت سنیہ اور اشاعت سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے لئے پیدا فرما کر ہم بھولے بھٹکوں پر ایسا احسان عظیم فرمایا جس کا شکریہ ادا کرنے سے ہماری زبان وقلم یکسر عاجز وقاصر ہیں۔

پیدائش

حضرت قبلہ وکعبہ قاضی محمد صدر الدین مدظلہم العالی ۱۳۲۰ ہجری بمقام کوٹ نجیب اللہ (ضلع ہری پور) قریش کے ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئے، آپ کا خانوادہ صدیوں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضۂ ربانی کی بجا آوری میں معروف ومشہور ہے، جس میں بہت سے مقتدر اور معزز علماء وفضلاء اسلام ہو گذرے ہیں، مگر آپ کی ولادت باسعادت سے اس پاکباز گھرانے کی عزت وعظمت میں اور اضافہ ہوا۔

آپ کے والد ماجد حضرت قبلہ جناب قاضی محمد فیروز الدینؒ ایک عالم باعمل اور یگانہ روزگار پیشوا تھے۔ آپ سچے معنوں میں شریعت غرا کے پابند اور اجراء احکام دین میں بہت نڈر تھے، اور اس سلسلے میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے والد ماجد قاضی محمد نادر الدینؒ اور دادا قاضی محکم الدینؒ بھی صاحبان علم وفضل اور اپنے وقت کے بزرگان دین میں شمار ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جنّات کے بھی ماویٰ وملجا تھے۔

حضرت قبلہ وکعبہ مدظلہم العالی کا ننھیال بھی علم وفضل کا سرچشمہ تھا۔ آپ کے نانا صاحب جناب قاضی محمد فیض عالمؒ جامع معقول ومنقول ہونے کے ساتھ ساتھ وقت کے بڑے اہل دل اور مرجع خلائق تھے۔ معقولات میں خیر آبادی مکتب فکر کے داعی اور حضرت استاذ الاساتذہ مجاہد اعظم علامہ فضل حقؒ خیر آبادی، اسیر سراندیپ کے شاگرد رشید تھے اور منقولات میں سلسلۂ ولی اللّٰہی سے وابستہ تھے۔ ان کا علمی رتبہ پاک وہند میں مسلم الثبوت تھا اور علمی تحقیق میں درجہ اجتہاد کو پہنچے ہوئے تھے۔ صاحب تصانیف تھے اور مشاہیر ملک ان کے کلام سے استناد کرتے تھے۔

گاؤں میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ قدیم زمانے سے علماء میں اختلافی رہا ہے۔ قاضی فیض عالمؒ صاحب کا نظریہ متقدمین احناف کی رائے کے مطابق یہی تھا کہ گاؤں میں جمعہ جائز نہیں۔ اس پر انہوں نے یہ دلیل قائم کی کہ حضور ﷺ ہجرت کے بعد قباء میں چودہ دن قیام پذیر رہے، مگر وہاں آپ ﷺ نے جمعہ ادا نہیں فرمایا، حالانکہ جمعہ مکہ مکرمہ میں فرض ہو چکا تھا۔ اگر گاؤں میں جمعہ جائز ہوتا تو آپ ﷺ ضرور وہاں جمعہ ادا فرماتے۔ اِس استدلال میں چونکہ قاضی فیض عالمؒ صاحب متفرد تھے اور آپ سے پہلے یہ دلیل کسی نے بیان نہیں کی تھی، اس لئے دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کاشمیری اس استدلال میں آپ کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں

ثُمَّ اِنَّ الْجُمُعَةَ فُرِضَتْ بِمَكَّةَ وَلَمْ يَتَمَكَّنِ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ اِقَامَتِهَا حَتّٰى وَرَدَ الْمَدِيْنَةَ فَاَقَامَهَا، وَفِيْهِ اِسْتِدْلَالٌ لِلْحَنَفِيَّةِ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى اِشْتِرَاطِ الْمِصْرِ، حَيْثُ لَمْ يَجْمَعِ النَّبِيُّ ﷺ فِيْ قُبَاءَ مَعَ قِيَامِهٖ اَرْبَعَ عَشَرَةَ يَوْمًا. وَ اَوَّلُ جُمُعَةٍ اَقَامَهَا حِيْنَ وَرَدَ الْمَدِيْنَةَ فِيْ مَحَلَّتِهَا، كَمَا فِي الرِّوَايَاتِ. وَ اَوَّلُ مَنِ اسْتَدَلَّ بِهِ الْمَوْلَوِيُّ فَيْضُ عَالَمُ الْهَزَارَوِي.

(فیض الباری، کتاب الصلوٰۃ، ج ۲، ص ۴۳۳، مطبوعہ مطبع حجازی، قاہرہ)

ترجمہ: پھر یہ کہ جمعہ مکے میں فرض ہوا تھا اور حضور ﷺ اس کے قائم کرنے پر قادر نہ ہو سکے، تا آنکہ مدینہ تشریف لائے تو وہاں قائم فرمایا۔ احناف رحمہم اللہ تعالیٰ جنہوں نے نماز جمعہ کے لئے شہر کی شرط لگائی ہے، ان کے لئے یہ حدیث دلیل ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے قباء میں چودہ دن قیام فرمانے کے باوجود جمعہ ادا نہ فرمایا،

یہاں تک کہ جب مدینہ کے ایک محلے میں ورود مسعود فرمایا، تو پہلا جمعہ قائم فرمایا جیسا کہ روایات میں آیا ہے۔ اور پہلے وہ شخص جنہوں نے اس سے استدلال کیا، وہ مولوی فیض عالم ہزاروی ہیں۔

تعلیم و تربیت

حضرت قبلہ دامت برکاتہم کے والد ماجد نے اپنے آبائی گاؤں سے اپنے خسر صاحب کی دعوت پر قریۂ درویش (نزد ہری پور) میں نقل مکانی فرمائی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے قبلہ والد صاحب کے زیر سایہ تکمیل کو پہنچی، چنانچہ آپ کی کامل توجہ کی بدولت حضرت قبلہ نے تھوڑے ہی عرصے میں مروجہ علوم میں کمال پیدا کرلیا؛ تاہم آپ کی لگن کا یہ عالم تھا کہ آپ نے ہزارہ کے مشاہیر علماء، جیسے مولانا حمید الدین بفوی اور مولانا قطب الدین ؒغور غشتی سے بھی فیض حاصل کیا۔

ہندوستان کا سفر

آپ نے اس سلسلے میں قرب و جوار کی مسافرت پر اکتفاء نہیں کیا؛ بلکہ علمی تجسس اور تحقیق کی غرض سے ہندوستان کے دور دراز شہروں کے سفر کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور مختلف شہروں میں مشاہیر فضلاء کے حلقۂ درس میں شامل ہونے کے بعد رامپور تشریف لے گئے، جہاں آپ مدرسہ عالیہ کے پرنسپل عالی جناب مولانا محمد فضل حق صاحب کے زمرۂ تلمذ میں داخل ہو گئے، جو حضرت علامہ عبدالحق خیر آبادی کے شاگرد رشید اور انہیں کے جانشین تھے۔ آں جناب اپنے وقت کے مایہ ناز فلسفی اور کئی تالیفات کے مؤلف تھے۔ ۳۴-۱۹۳۳ء جب راقم علامہ استاذی مولانا معین الدین صاحب اجمیریؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوا تو سالانہ امتحان لینے کے لئے حضرت علامہ فضل حق صاحب تشریف لائے، چنانچہ راقم کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ

نے مجھ ناچیز سے محاکمات، شرح اشارات اور شرح مسلم الثبوت میں امتحان لیا تھا۔ آہ! وہ پیاری صورتوں اور پاک سیرتوں کے مالک اور محبت کے مجسمے کہاں گئے، بقول مرزا غالب:

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں!

غرضیکہ معقولات کی تحصیل و تکمیل حضرت قبلہ قاضی صدرالدین صاحب مدظلہم العالی نے رامپور (ہند) میں حضرت مولانا فضل حقؒ رامپوری کے ہاں فرمائی اور اس میں درجۂ کمال حاصل کیا۔

بھوپال کا سفر

ریاضی کی تکمیل کے متعلق راقم کے استفسار پر فرمایا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے آپ نے بھوپال کا سفر کیا اور وہاں حضرت مولانا غلام محی الدینؒ صاحب سے ریاضی کی تکمیل فرمائی اور احادیث کی چند کتابیں بھی پڑھیں لیکن سند حدیث حضرت شیخ الحدیث مولانا بشیر احمدؒ صاحب سے حاصل فرمائی۔

دارالعلم حیدر آباد دکن کا سفر

اس کے بعد آپ شہر علم حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ متحدہ ہندوستان میں علمی ترقی کے لحاظ سے حیدر آباد دوسرا قرطبہ تھا۔ اطراف واکناف کے سارے فضلاء حیدر آباد میں جمع تھے۔ حضرت قبلہ فرماتے تھے کہ اس زمانے میں معتمد امور مذہبی اختر یار جنگ صاحب تھے، ان سے مراسم پیدا ہو گئے اور آخر کار آپ سے ان کا دلی انس پیدا ہو گیا، جس کی وجہ سے وہ آپ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اکثر مسائل میں وہ آپ ہی سے رجوع فرماتے تھے۔ اختر یار جنگ صاحب فرمایا کرتے تھے، ''حضرت! میرے پاس تو عجم و عرب کے فضلاء آتے ہیں مگر جو علمی فضیلت اللہ

پاک نے آپ کو عطا فرمائی ہے کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آئی۔"

حج کا پہلا مبارک سفر

اختر یار جنگ نے حضرت قبلہ کے علمی شغف اور پختگی افکار سے متاثر ہو کر ایک موقعے پر آپ کو آٹھ سو روپے کی تھیلی پیش کی جسے حضرت قبلہ نے حج مبارک کے لئے استعمال فرمایا، اس طرح آپ نے غالباً ۱۹۲۷ء میں پہلا حج مبارک فرمایا۔

قیام حرمین شریفین زاداللہ شرفہما کے زمانے میں سعودی عرب کے علماء اور مصر و شام کے فضلاء سے علمی ملاقاتیں اور متعدد مباحثے ہوئے، جن سے وہ بڑے متاثر ہوئے اور سب اپنے اپنے ملک میں قیام فرمانے پر مصر ہوئے، مگر آپ نے معذرت ظاہر فرمائی کہ سرزمین ہند میں اشاعت اسلام کی ضرورت دیگر بلاد اسلامیہ سے کہیں بڑھ کر ہے۔

صدر الکلام کی تالیف

آج سے نصف صدی قبل تک اسلامی عقائد کا اثبات وثبوت عقلی دلائل پر مبنی تھا۔ آریہ، عیسائی اور اہل اسلام کے درمیان باقاعدہ مناظرے ہوا کرتے تھے، ہمارے حضرت قبلہ کو اللہ تعالیٰ نے معقولات ومنقولات دونوں میں ید طولیٰ عطا فرمایا تھا۔ اسی ماحول سے متاثر ہو کر آپ نے قیام حیدر آباد دکن کے زمانے میں متکلمین کی طرز پر "عقائد الاسلام" کا مسودہ مرتب فرمایا تھا، جو اب پچاس (۵۰) (اب پچاسی ۸۵) برس کے بعد کتابی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

وطن کی طرف مراجعت

حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد آپ اپنے آبائی گاؤں درویش واپس تشریف لائے اور قریبی شہر "ہری پور" میں درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔ تدریس

کے ساتھ ساتھ امامت وخطابت کے فرائض بھی بجالاتے رہے۔اسی زمانے میں آپ کی شادی خانہ آبادی بھی علاقے کے ایک معروف قصبے کوٹ نجیب اللہ کے ایک بڑے علمی گھرانے میں ہوگئی۔آپ کے خسر محترم مولینا عمر دینؒ ہزاروی نہایت محقق عالم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔اعلٰحضرت مولانا احمد رضا خانؒ بریلوی کے ساتھ گہری وابستگی تھی، اس لئے اُن کی بیشتر تصنیفات اعلٰحضرت کی تقریظات سے مزین ہیں۔

بیعت

علوم شریعت کے ساتھ ساتھ آپ طریقت کی جانب بھی طبعی میلان رکھتے تھے، چنانچہ تکمیل علوم باطنی کے لئے آپ خانقاہ سراجیہ مجددیہ ''کندیاں'' (ضلع میانوالی) میں اعلیٰ حضرت مولانا ابوالسعد خواجہ احمد خان قدس سرہ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے بلاتوقف آپ کو سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں داخل فرمایا۔ایک سال سات ماہ تک آپ نے مسلسل اپنے شیخ باصفا سے تربیت طریقت حاصل کی۔آپ بالالتزام ہمہ اوقات اپنے حضرت عالی مقام کے حضور میں حاضر رہتے تھے، اعلیٰ حضرت بھی آپ کے علمی مقام، شرافت طبع اور اثر پذیری کے بڑے قدردان تھے اور بڑھ چڑھ کر آپ پر نگاہ کرم فرماتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قلیل مدت میں آپ اپنی فطرت قابلہ اور استعداد عالیہ اور اپنے شیخ مکرم سے قلبی وابستگی اور ادب واحترام کے سبب سلوک مجددی کے تمام مدارج طے کر کے خلعت کبریٰ سے سرفراز ہوئے اور مرشد گرامی قدر کے ارشاد کے مطابق مخلوق خدا کی رشد وہدایت کے لئے اپنے وطن مالوف کو واپس تشریف لائے۔

نقل مکانی

ابتداء میں آپ نے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کی اشاعت وتبلیغ کا آغاز

اپنے گاؤں درویش سے کیا اور نوع انسان کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ وہاں چونکہ خانقاہ شریف کا احاطہ بہت مختصر تھا، اس لئے گاؤں سے بجانب مشرق، ریلوے سٹیشن ہری پور کے قریب عید گاہ سے متصل خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ کی بنیاد رکھی، یہ مقام کافی وسیع بھی تھا اور الگ تھلگ بھی، طالبانِ سلوک کو جس تنہائی اور یکسوئی کی ضرورت ہوتی وہ یہاں میسر تھی۔

دار العلوم ربانیہ

خانقاہ شریف کے احاطے کی شمالی جانب ایک دینی مدرسہ دار العلوم ربانیہ بھی جاری فرمایا، حضرت قبلہ کا خاندان پشتہا پشت سے دینی اور اسلامی وجاہت میں ممتاز رہا ہے اور عالم کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہمہ وقت علمی مشاغل میں مستغرق ہو، بالخصوص خاندان عالیہ خیر آبادیہ کو اس باب میں منفرد مقام حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دو (۲) سال قبل تک حضرت قبلہ بہ نفس نفیس منتہی طلباء کو پڑھاتے رہے۔ دار العلوم میں ایک بیت القراء بھی ہے، جہاں قاری صاحبان بچوں کو کلام الٰہی حفظ کراتے اور تجوید سکھاتے ہیں۔ مدرسے کی عمارت پختہ ہے اور کئی کمروں پر مشتمل ہے۔

حضرت قبلہ کے اکلوتے صاحبزادے

یہ حضرت قبلہ دامت برکاتہم کے فیضان نظر، کمال تربیت اور انوار صحبت ہی کا نتیجہ ہے کہ بفضل الٰہی آپ کے اکلوتے بیٹے جناب قاضی عبدالدائم دائم بارک اللہ فی عمرہ وفضلہ اپنی نوعمری کے باوجود دینی علوم کے مایۂ ناز عالم یگانہ کا مرتبہ حاصل کر چکے ہیں۔ آپ نے سارے علوم وفنون اپنے مشفق و فاضل والد بزرگوار کے درس عالیہ میں اخذ کرنے کے بعد ایک مشہور دینی دار العلوم نعمانیہ، لاہور سے فضیلت کی امتیازی سند حاصل کی ہے اور قرآن حکیم کو بھی نہایت قلیل عرصہ میں تجوید کے ساتھ حفظ

کرلیا ہے۔ عین عالم شباب میں زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔ الحمدللہ کہ آپ ہر لحاظ سے اپنے نامور والد ماجد کے صحیح جانشین ہیں اور سارا وقت درس وتدریس، وعظ وتبلیغ اور خدمت اسلام میں خرچ فرماتے ہیں، پنج وقتہ نماز کی امامت اور خطابت کے فرائض بھی آپ ہی انجام دیتے ہیں، غرض صاحبزادہ صاحب کی ذاتِ گرامی متوسلین کے لئے سرمایہ فخر وناز ہے۔

حقیر فقیر: محمد اسرائیل کان اللہ لہ، (۱۶ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ)

نوٹ:- واضح رہے کہ صاحبزادۂ عالی وقار حضرت قاضی عبدالدائم دائم مدظلہ العالی کے بارے میں مولانا محمد اسرائیل مرحوم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ آج سے تقریباً پینتیس ۳۵ سال پہلے کی بات ہے؛ جبکہ صاحبزادہ صاحب کی عمر ۲۶، ۲۷ سال ہوگی۔ اس کے بعد آپ نے علم وفضل میں جو عروج وکمال حاصل کیا اور تحریر وتقریر کے ذریعے جس طرح خدمت دین کا حق ادا کیا، اس کی تفصیلات جاننے کے لئے آپ کے تعارف پر مشتمل کتابچے ''رہنما'' کا مطالعہ مفید رہے گا، جسے اس عاجز نے بہت تحقیق و محنت سے مرتب کیا ہے۔

(پروفیسر محمد سلیم، ملتان)

✿✿✿

فہرس

پہلا باب
اَلْاِیْمَانُ بِاللّٰہ
یعنی
اللہ تعالیٰ پر ایمان
ذات و صفات سے متعلق ۲۳ انتہائی پیچیدہ
اور مشکل سوالات کے نہایت محققانہ عقلی جوابات

***

سوال ۱

لفظ اللہ کے کیا معنی ہیں اور اسلامی اصطلاح میں اس سے کیا مراد لی جاتی ہے؟

جواب ۱

لفظ اللہ کے معنی معبود اور قابلِ پرستش کے ہیں اور مراد اس سے وہ ذات ہے جو اپنی ذات اور صفاتِ کمالیہ کے لحاظ سے بالکل یکتا (Unique) اور سب عیبوں سے پاک ہے۔

سوال ۲

کیا ایسی ذات کوئی موجود بھی ہے یا فقط عقلی تصور ہی تصور ہے؟

جواب ۲

یہ ذاتِ گرامی فی الواقع موجود ہے اور اس کا وجود کسی عقلی تصور کا محتاج نہیں؛ بلکہ تمام عقول اس کی محتاج ہیں---اس لئے کہ

{الف} اس عالم (World) کے سارے اجزاء تغیر پذیر (Changeable) ہیں۔ اس عالم کے کسی جزو پر بھی نظر ڈالی جائے تو اس میں کسی نہ کسی وجہ سے تغیر و تبدل پایا جائے گا۔ یہاں تک کہ تحقیقات جدیدہ کی رو سے کراتِ علویہ (Heavenly

(Bodies) یعنی چاند، سورج وغیرہ میں بھی تغیر ثابت ہو چکا ہے۔ جب سب اجزائے عالم متغیر ہوئے تو مجموعہ عالم بھی متغیر ہوا، کیونکہ مجموعہ (Collection) بعینہ انہی اجزاء سے عبارت ہوا کرتا ہے، جب ان کو ہیئتِ اجتماعیہ (Collective Form) لاحق ہو جائے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس مجموعۂ عالمِ متغیرات (World of Variables) کے تبدل و تغیر کا سبب (Reason) اور علت (Cause) کیا ہے؟ یہ تو ممکن نہیں کہ خود ہی یہ عالم اپنے تغیر و تبدل کا سبب ہو۔ اس لئے کہ کوئی چیز اپنے تبدل و تغیر کو نہیں چاہتی، جب تک اس پر کوئی خارجی اثر نہ ہو۔ مثلاً پانی اپنے تغیر کو نہیں چاہتا، لیکن جب اس پر کوئی مخالف اثر پڑتا ہے تو متغیر ہو جاتا ہے۔ اگر حرارت اور گرمی اس پر اثر انداز ہو تو بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے اور اگر برودت اور سردی اس کو متاثر کرے تو جم جاتا ہے۔ ایسے ہی تمام اشیاء کو قیاس کر لیجئے!

لہٰذا اس مجموعۂ عالم متغیرات کے لئے کوئی علت اور سبب ایسا ہونا ضروری ہے جس کے آگے یہ عالم اپنی مجموعی حیثیتِ تغیر سے مسخر و مطیع ہو۔

یہ بھی ضروری ہے کہ وہ علت خود قابلِ تغیر نہ ہو، اس لئے کہ اگر اس کو قابل تغیر مانا جائے تو وہ بھی مجموعۂ متغیرات میں، جو اس کا معلول (Effect) ہے داخل ہو جائے گی، کیونکہ عالم تمام متغیرات کے مجموعے کا نام ہے۔ حالانکہ علت معلول سے خارج و مغائر ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ یہ علت قابلِ تغیر نہ ہو ---- اور اللہ اسی ذات کا نام ہے، جو تمام موجودات کی علت ہے اور تغیر و حدوث سے برتر ہے۔

{ب} شب و روز جتنے واقعات رونما ہوتے ہیں، ضرور ان کے لئے کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اگر ان واقعات کا ظاہر ہونا کسی سبب پر موقوف نہ تھا تو پھر ان کا ظہور اس سے پہلے کیوں نہیں ہوا؟ اس سوال کا یہی جواب ہوگا کہ پہلے ان

کے اسباب موجود نہ تھے۔ تو پھر یہ سوال ہوگا کہ اسباب پہلے کیوں موجود نہیں ہوئے تھے؟ اس کا یہی جواب ہوگا کہ ان اسباب کے اسباب موجود نہ تھے، پھر ان اسباب کے بارے میں بھی یہی سوال ہوگا، جب تک کہ آخر میں کوئی ایسا سبب نہ مانا جائے جو اپنے وجود میں مستقل اور واجب الوجود (Necessary Being) ایجاد میں خودمختار ہو، اور کسی سبب و علت کا محتاج نہ ہو۔ بصورتِ دیگر سلسلۂ اسباب غیر متناہی (Infinite) ہو جائے گا۔ حالانکہ فلسفے میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ غیر متناہی کا وجود ناممکن اور محال ہے۔ اس لئے آخر میں ایک ایسا سبب ماننا ضروری ہوا جو تمام اسباب کا سبب ہو اور سب انتہاؤں کی انتہا ہو --- اسی کا نام اللہ ہے۔ وہی ذات تمام موجودات کی علت و سبب ہے، خودمختار ہے اور خود کسی علت و سبب کی محتاج نہیں۔

{ج} جب اس عالم کے حسنِ نظام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بالضرور یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا منتظم اور مرتب (Organizer) کوئی بہت بڑا حکیم ہے جو وسیع علم اور قدرت رکھتا ہے۔ کیونکہ نظام و ترتیب، منتظم و مرتب کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ جنگل اور باغ میں یہی تو فرق ہوتا ہے کہ جنگل کے درخت غیر مرتب اور غیر منظم ہوتے ہیں اور باغ کے درخت نظم و ترتیب سے لگے ہوئے ہوتے ہیں، جس سے باغ اور جنگل میں بخوبی تمیز ہوسکتی ہے، اور جب باغ کا نظم و نسق عمدہ ہو تو نہ صرف اس کے لگانے والے کے موجود ہونے کا یقین ہو جاتا ہے؛ بلکہ فن باغبانی میں اس کی مہارت اور کمال میں بھی کوئی شبہ نہیں رہتا۔ ایسے ہی تمام مصنوعات کو سمجھ لیجئے، کہ ان کی صنعت اور بناوٹ سے صانع کا وجود اور دیگر حال معلوم ہو جاتا ہے۔

جب ایک مصنوعی شے کو دیکھ کر اس کے صانع اور بنانے والے کے کمال کا یقین کرلیا جاتا ہے، تو قدرتی موجودات کو عجیب و غریب حکمتوں سے لبریز پا کر اس بات کا یقین کیوں نہیں ہوسکتا کہ ان کا پیدا کرنے والا کوئی بہت بڑا قادر وسیع العلم اور

کامل حکیم ہے؟

قارئین کی دلچسپی کے لئے یہاں ایک دہریئے (Atheist) اور عالم دین کا مناظرہ نقل کیا جاتا ہے۔

ایک دفعہ کسی عالم اور ایک دہریئے کے درمیان مناظرہ طے ہوا۔ چنانچہ وقت مقرر پر سب لوگ جمع ہو گئے اور فریقین کا انتظار کرنے لگے۔ دہریہ جوش وخروش میں وقت سے پہلے ہی موقع پر پہنچ گیا مگر اتفاق سے عالم صاحب قدرے دیر سے آئے۔ دہریئے کو موقع مل گیا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر کہنے لگا--- ''دیکھ لیجئے! مولوی صاحب ابھی تک نہیں آئے --- اور آتے بھی کیسے؟ جھوٹا آدمی میدان میں بھلا کب آسکتا ہے؟''

اسی اثنا میں عالم صاحب بھی آ گئے اور فرمانے لگے ''نہیں حضرات! میں جھوٹا نہیں ہوں؛ بلکہ آتے وقت ایک عجیب وغریب واقعہ دیکھنے میں آیا جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا اور مجھے آنے میں دیر لگ گئی''۔

دہریئے نے پوچھا، ''ایسا کونسا حیران کن واقعہ آپ نے دیکھ لیا کہ آپ کو یہاں پہنچنے میں اتنی تاخیر ہو گئی؟

عالم صاحب فرمانے لگے، ''میں دریا کے کنارے کنارے آ رہا تھا، یکا یک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک درخت خود بخود کٹ کر دریا میں گر پڑا، اور اس سے خود ہی فوراً ایک کشتی تیار ہو گئی، پھر خود ہی سواریوں کو لانے لے جانے لگی اور ان سے کرایہ بھی وصول کرنے لگی۔ اس منظر نے مجھے حیرت میں ڈال دیا اور میں اسے دیکھنے میں کھو گیا، اس لئے مجھے آنے میں دیر ہو گئی''۔

دہریئے نے یہ بات سن کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور حاضرین سے کہنے لگا۔

''دیکھا آپ نے؟--- ملا صاحب کی قوت وہمیہ اور خیالیہ نے ان کی

عقل کو مفلوج کر دیا ہے اور انہیں ناممکن چیزیں آنکھوں سے نظر آنے لگی ہیں---بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کاٹنے والے کے بغیر درخت کٹ جائے اور بنانے والے کے بغیر کشتی بن جائے؟

عالم صاحب نے فرمایا---"ارے نادان! جب ایک درخت کا کٹنا بغیر کسی کاٹنے والے کے اور ایک کشتی کا بننا بغیر کسی بنانے والے کے ناممکن ومحال ہے تو اس ساری کائنات کا وجود بغیر پیدا کرنے والے کے کیسے ممکن ہے؟"

یہ بات سن کر دہریہ حیران رہ گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

۳ سوال ۳

ان دلائل سے ہمیں یہ یقین آ گیا کہ ضرور کوئی ایسی علت ہے جو اپنے وجود میں کسی کی محتاج نہیں اور باقی سب موجودات اس کی محتاج ہیں، لیکن یہ کیسے ثابت ہوگا کہ وہ تمام صفاتِ کمالیہ کی جامع اور تمام عیوب سے پاک ہے؟

۳ جواب ۳

جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ ذات اپنے وجود میں کسی کی محتاج نہیں اور دوسری تمام موجودات اس کی محتاج ہیں، تو معلوم ہوا کہ بلحاظ وجود تمام موجودات سے اس کا وجود زیادہ کامل ہے۔ لہٰذا صفات کے لحاظ سے بھی اس کا سب سے کامل ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ تمام صفات وکمالات وجود کے تابع ہیں۔ پس جو چیز اپنے وجود میں کامل ہوگی، وہی صفات میں بھی کامل ہوگی۔

چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے وجود کے لحاظ سے ہر چیز سے کامل ہے، اس لئے صفات کے اعتبار سے بھی اکمل واعلیٰ ہے اور تمام صفات کمالیہ کا جامع ہے۔

علاوہ ازیں دلائل مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ وہ ذات اپنی تدبیر اور

علم وحکمت کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ درجہ پر ہے، جس کے ادراک (جاننے) سے عقل انسانی قاصر ہے اور اِنہی صفات پر دیگر صفاتِ کمالیہ کا دارومدار ہے۔ لٰہذا تمام صفاتِ کمالیہ اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہوں گی اور اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہو، کیونکہ جو صفت نقص اس میں فرض کی جائے گی، اس کے بالمقابل جو صفت کمال ہوگی، وہ اللہ تعالیٰ میں نہیں پائی جائے گی۔ مثلاً اگر اس کو معاذ اللہ جہالت سے متصف مانا جائے تو لازم آئے گا کہ وہ علم سے خالی ہو، اس طرح اللہ تعالیٰ تمام صفات کمال کا جامع نہیں رہے گا، حالانکہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ وہ سب کمال والی صفتوں کا جامع ہے۔ لٰہذا وہ ہر عیب اور نقص سے قطعی طور پر پاک ہے۔

سوال

اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ہے یا وہ یگانہ و یکتا بغیر کسی شریک کے ہے؟

جواب

وہ اپنی ذات وصفات میں یکتا ہے، اس لئے کہ:-

{الف} اگر اس کا کوئی شریک ہو تو بعض وجوہ سے اللہ تعالیٰ سے ممتاز (Distinct) اور مختلف ہوگا، اس لئے کہ دو چیزوں میں امتیاز ضروری ہے، ورنہ دونوں ایک ہوں گی۔

یہ بھی ضروری ہے کہ جو صفاتِ امتیاز ایک میں پائی جائیں، وہ دوسری میں نہ پائی جائیں تب ہی امتیاز قائم ہو سکے گا۔

پھر دیکھنا یہ ہے کہ جو صفاتِ امتیاز ان دونوں میں پائی جاتی ہیں، وہ صفاتِ کمال ہیں یا صفاتِ نقص؟ اگر صفاتِ کمال ہیں تو ہر ایک شریک تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع نہ ہوا، کیونکہ جو صفاتِ کمالیہ ایک میں ہیں ان سے دوسرا خالی ہے اور جو دوسرے

میں ہیں ان سے پہلا خالی ہے۔ حالانکہ پہلے ثابت کیا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب صفاتِ کمالیہ کا جامع ہے۔

اگر یہ صفات صفاتِ نقص ہیں تو دونوں شریک ناقص ہوئے، لیکن پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے کامل ہے، لہٰذا اس کا کوئی شریک ہونا محال (Imposible) ہے۔

{ب} اگر دو خدا مانے جائیں، تو ہم پوچھتے ہیں کہ دونوں خداؤں میں سے ایک خدا دوسرے کو زیر اثر کرنے پر قادر ہے یا عاجز؟ اگر قادر ہے تو دوسرا مغلوب ہؤا، ظاہر ہے کہ مغلوب غالب کا شریک نہیں ہوسکتا اور نہ مغلوب قابل پرستش ہوسکتا ہے؛ بلکہ جو غالب ہوگا وہی خدا رہے گا۔ اور اگر عاجز ہے تو یہ مغلوب ہؤا۔ پھر یہ خدا ہونے کے قابل نہیں اور اگر دونوں ایک دوسرے سے عاجز ہیں تو دونوں خدا ہونے کے قابل نہیں۔

{ج} اگر دو خدا ہوں تو دونوں کے درمیان ذاتی (Personal) یا صفاتی (Attributive) تغائر (Difference) ضرور ہوگا، کیونکہ دو ہونا اختلاف و تغائر کے بغیر ممکن نہیں۔ پھر ان دونوں خداؤں میں ذاتی اور صفاتی تغائر کی وجہ سے اختلاف و نزاع ہونا بھی ممکن ہوگا ـــــ اگر بالفرض دونوں کا کسی معاملے میں اختلاف ہوگیا تو اس صورت میں دونوں کی مراد پوری ہوگی، یا ایک کی، یا دونوں ناکام رہیں گے؟

یہ تو ممکن نہیں کہ دونوں کی مراد پوری ہو کیونکہ ایک نے مثلاً زید کو باقی رکھنا چاہا اور دوسرے نے اس کو فنا کرنا چاہا، تو دونوں کی مراد کیسے پوری ہوسکتی ہے؟ کیونکہ ایک ہی وقت میں ایک چیز کی بقا اور فنا ناممکن ہے ورنہ اجتماع نقیضین (Unification of Contradictories) لازم آئے گا جو کہ قطعی طور پر باطل ہے۔ اگر ایک کی مراد پوری ہوئی تو دوسرا ناکام رہا، پھر وہ خدا کیسے ہوسکے گا؟ کیونکہ خدا تو تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع

ہے اور عجز و ناکامی جیسے تمام عیوب سے پاک ہے۔

اگر دونوں کی مراد پوری نہ ہو تو یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ دونوں میں سے ایک کی مراد پوری ہونا ضروری ہے۔ مثلاً زید کی بقا یا فنا، کیونکہ ارتفاعِ نقیضین (Removal of Contradictories) ممکن نہیں ① غرضیکہ یہ تینوں صورتیں ناممکن ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کا شریک ہونا بھی ناممکن ہے۔

۵ سوال ۵

کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور چیز بھی بذاتِ خود (By Himself) موجود ہے یا سب اپنے وجود میں اس کی محتاج ہیں؟

---

① ← مندرجہ ذیل باتیں ملحوظ رہیں تو دلیل کو سمجھنے میں آسانی رہے گی۔

{ا} کسی چیز کا اثبات اور اس کی نفی آپس میں نقیضین ہوتی ہیں۔ مثلاً "زید موجود ہے" اور "زید موجود نہیں ہے"

{ب} اجتماعِ نقیضین ناممکن ہے۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ دونوں نقیضین بیک وقت موجود ہوں، مثلاً ایک ہی وقت میں زید موجود بھی ہو اور غیر موجود بھی۔

{ج} ارتفاعِ نقیضین بھی ناممکن ہے۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ دونوں نقیضین بیک وقت زائل ہو جائیں اور ان میں سے کوئی نہ پائی جائے، مثلاً زید موجود بھی نہ ہو اور غیر موجود بھی نہ ہو، ان میں سے ایک بات کا ہونا بہر حال ضروری ہے۔

{د} اسی طرح زید کی فنا اور زید کی بقا آپس میں نقیضین ہیں۔ اس لئے نہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ زید ایک ہی وقت میں فنا اور بقا دونوں سے متصف ہو کیونکہ اس صورت میں اجتماعِ نقیضین لازم آتا ہے اور نہ یہ ہوسکتا ہے کہ زید ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی متصف نہ ہو۔ کیونکہ اس طرح ارتفاعِ نقیضین لازم آتا ہے اور اجتماعِ نقیضین و ارتفاعِ نقیضین دونوں باطل ہیں۔ [دائم]

۵ جواب ۵

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز بذاتِ خود موجود نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی چیز اس کے سوا بذاتِ خود موجود ہو تو چونکہ صفات ذات کی فرع (Offshoot) ہیں، لہٰذا یہ چیز باقی صفات میں بھی مستقل ہوگی اور اس طرح یہ شئے اللہ تعالیٰ کے مساوی اور اس کی شریک ہو جائے گی۔ حالانکہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اس کے بغیر کوئی چیز خود بذات خود موجود نہیں ہے؛ بلکہ سب اشیاء اپنے وجود میں اس کی محتاج ہیں۔

۶ سوال ۶

کیا اللہ تعالیٰ کے لئے جسم (Body) ہے؟

۶ جواب ۶

نہیں ہے، اس لئے کہ جسم قابل ابعاد ثلٰثہ ① اور مرکب ہوا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ترکیب سے پاک ہے، کیونکہ ترکیب کے لئے متعدد اجزاء کی ضرورت پڑتی ہے اور مرکب چیز اپنی ترکیب میں ان اجزاء کی محتاج ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کسی شے کا محتاج نہیں۔ لہٰذا وہ مرکب نہیں ہوسکتا، اور جب مرکب نہیں ہوسکتا تو اس کے لئے جسم بھی نہیں ہوسکتا، کیونکہ جسم کے لئے مرکب ہونا ضروری ہے۔

۷ سوال ۷

کیا اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی صورت وشکل ہے؟

---

①← ''قابل ابعاد ثلٰثہ'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جسم میں لمبائی، چوڑائی اور گہرائی یعنی (Three Dimentions) پائی جاتی ہیں۔

جواب ۷

نہیں ہے، اس لئے کہ صورت وشکل اس شے کے لئے ہؤا کرتی ہے جس کی حدود (Limits) سطوح (Planes) ہوں۔ مثلاً اگر کسی شئے کی ایک سطح ہو تو اس کو کروی الشکل (Spherical) کہتے ہیں۔ اگر دو ہوں تو اسے مثنیٰ (Two Sided) اگر تین ہوں تو مثلث (Triangle) اور اگر چار ہوں تو مربع (Square) کہا جاتا ہے۔ اور سطح انتہائے جسم کو کہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ چونکہ جسم نہیں ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ لہٰذا وہ سطح اور شکل وغیرہ جسمانی کیفیات سے بالکل مبرا اور پاک ہے۔

سوال ۸

کیا اللہ تعالیٰ کا کسی چیز میں حلول (Solution) ہوسکتا ہے؟

جواب ۸

نہیں، اس لئے کہ:

{الف} حال محل کا محتاج ہوتا ہے [1] اور ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کا محتاج نہیں۔

---

① ← جب کوئی چیز کسی دوسری چیز میں یوں گھل مل جائے کہ اس کا اپنا علیحدہ وجود باقی نہ رہے تو اس کو "حلول" کر جانا یا حل ہو جانا کہا جاتا ہے۔ اس میں دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک حلول کرنے والی، اس کو "حال" (Solute) کہا جاتا ہے اور دوسری وہ جس میں "حلول" ہؤا ہے، اس کو محل (Solvent) کہا جاتا ہے۔ مثلاً چینی کو پانی میں ڈال کے ہلائیں تو چینی پانی میں حلول کر جائے گی، یا بالفاظ دیگر حل ہو جائے گی۔ حلول کرنے والی چیز، یعنی چینی کو "حال" کہا جاتا ہے اور جس شئے میں چینی کا حلول ہؤا ہے، اسے "محل" کہا جاتا ہے۔

{ب} حال کا وجود محل کے ساتھ متصل ہوتا ہے، اتصال وانفصال اجسام کی خصوصیات ہیں اور اللہ تعالیٰ خواصِ اجسام (Corporeal Attributes) سے پاک ہے۔

{ج} اللہ تعالیٰ کا وجود اصلی ہے، باقی تمام اشیاء کا وجود اس کا فرع ہے اور اصل فرع میں حلول نہیں کرسکتا، اس لئے اللہ کا حلول کسی چیز میں ممکن نہیں۔

۹ سوال ۹

کیا اللہ تعالیٰ کا کوئی مکان (جگہ) ہے؟

۹ جواب ۹

نہیں ہے، اس لئے کہ:

{الف} مکان میں متمکن (Occupant) محدود ہوا کرتا ہے۔ اور محدود ہونا اجسام کی صفات میں سے ہے؛ جبکہ اللہ تعالیٰ اجسام کی صفات سے پاک ہے۔

{ب} اللہ تعالیٰ سب مکانوں کا خالق اور سب سے پہلے ہے، اس لئے اس کا کوئی مکان نہیں۔

{ج} مکان کا ہونا صفتِ کمال ہے یا صفتِ نقص؟---اگر صفتِ کمال ہے تو اپنے کمال میں غیر (مکان) کا محتاج ہوا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی شے کا محتاج نہیں ہے۔ اور اگر صفتِ نقص ہے تو اللہ تعالیٰ صفت نقص سے کیسے موصوف ہوسکتا ہے؛ جبکہ وہ تمام نقائص سے پاک ہے۔

۱۰ سوال ۱۰

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مکان نہ ہو؛ جبکہ ہر موجود کے لئے مکان کا ہونا لازمی ہے؟

۱۰ جواب ۱۰

ہر موجود کے لئے مکان کا ہونا لازمی نہیں ہے---ہاں، مادی موجودات (Material existents) کے لئے ضرور کوئی نہ کوئی مکان ہوتا ہے، مگر مادی اشیاء میں اور اللہ تعالیٰ میں کوئی مناسبت اور اتحاد نہیں ہے۔ اس لئے مادیات پر اللہ تعالیٰ کو قیاس کرنا قطعاً درست نہیں ہوسکتا؛ البتہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور علم وتصرف کے لحاظ سے ہر جگہ موجود ہے، مگر اس کے لئے کوئی خاص مکان مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

مثال کے طور پر روح کو دیکھئے! --- روح کا تصرف سارے بدن میں موجود ہے، لیکن اس کی کوئی جگہ اور جہت شرقی، غربی، جنوبی، شمالی، فوقانی اور تحتانی بدن میں مقرر نہیں کی جا سکتی اور نہ روح دیکھنے، چکھنے، سونگھنے اور چھونے سے معلوم ہو سکتی ہے؛ بلکہ عقل ہی ہمیں یقین دلاتی ہے کہ انسان میں اس مادی جسم کے علاوہ بھی کوئی ایسی شے ہے جو اپنے علم اور ارادے کے مطابق جسم میں تصرف کرتی ہے مگر اس کے لئے نہ کوئی جگہ ہے، نہ جہت (Direction) اور نہ حواسِ خمسہ (Five Senses) سے اس کا ادراک ہوسکتا ہے۔

۱۱ سوال ۱۱

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝﴾ [طٰہٰ، آیۃ ۵]

یعنی رحمٰن (اللہ تعالیٰ) عرش پر متمکن ہوا

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مکان ہے؟

۱۱ جواب ۱۱

استوٰی کے معنی بیٹھنے اور متمکن ہونے کے ہی نہیں آتے؛ بلکہ اس کے معنی

قصدواراده کے بھی ہیں، جیسا کہ دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے ﴿ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ﴾ [البقرة، آية ٢٩] یہاں استوی کے معنی قصد کے ہیں، یعنی زمین بنانے کے بعد آسمان بنانے کا قصد اور ارادہ کیا۔

نیز استوی کے معنی تصرف اور قبضہ کے بھی آتے ہیں، جیسا کہ ایک عربی شاعر کہتا ہے۔

قَدِ اسۡتَوىٰ بَشَرٌ عَلَى الۡعِرَاقِ
مِنۡ غَيۡرِ سَيۡفٍ وَّدَمٍ مُهۡرَاقٍ

(ایک انسان تلوار چلائے اور خون بہائے بغیر عراق پر قابض ہو گیا)

یہاں استوی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک انسان عراق پر بیٹھ گیا؛ بلکہ یہ معنی ہیں کہ ایک انسان عراق پر قابض اور متصرف ہو گیا۔

جب معلوم ہوا کہ استوی کے معنی بیٹھنے کے علاوہ اور بھی آتے ہیں اور دلائل قطعیہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی مکان میں نہیں؛ بلکہ سب مکانوں سے مقدم اور بالاتر ہے، تو یقیناً یہاں استوی کے معنی بیٹھنے کے نہیں ہوں گے؛ بلکہ وہی معنی مراد ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہوں، اور وہ تصرف وقدرت بھی ہو سکتے ہیں اور قصد بھی۔

۱۲ سوال ۱۲

اللہ تعالیٰ کا قبضہ اور تصرف تو ہر چیز پر محیط ہے، عرش کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے میں کیا مصلحت ہے؟

۱۲ جواب ۱۲

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا تصرف ہر چیز پر ہے۔ لیکن عرش چونکہ سب

چیزوں کو محیط ہے اور تمام مخلوق سے بڑا اور وسیع ہے اس لئے اس پر تصرف اور قبضہ سے سب اشیاء پر تصرف اور قبضہ ثابت ہو جاتا ہے۔ اس مصلحت سے عرش ① کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔

سوال ۱۳

کیا اللہ تعالیٰ کی اولاد، بیوی یا اور کوئی رشتہ دار ہیں؟

جواب ۱۳

نہیں ہیں، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی اولاد ہو تو پھر وہ اس کے اجزاء ہوں گے کیونکہ ولد جزو منفصل (Separated Part) کو کہا جاتا ہے اور ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اجزاء نہیں ہیں۔

اسی طرح بیوی بھی ناممکن ہے، کیونکہ بیوی خاوند کی شریکِ جنس (Homogeneous) ہوتی ہے اور دونوں کی اصل ایک ہوتی ہے اور ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی اصل نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے کوئی چیز نہیں ہے؛ بلکہ وہی سب اشیاء کے لئے اصل ہے۔

اسی طرح رشتہ دار بھی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ رشتہ دار وہ لوگ ہوتے ہیں جو

---

①← عرش کے معنی تخت یا چھت کے ہیں۔ اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان بنائے جو ایک دوسرے کے اوپر نیچے واقع ہیں۔ ساتویں آسمان سے بلند تر عرش ہے جو مقام خداوندی ہے۔ لیکن محققین علما کا خیال ہے کہ عرش مقام خداوندی نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت، عظمت اور جاہ وجلال کا مظہر ہے اور اس کے فیوض وتجلیات کا منبع وسرچشمہ ہے۔ ادبی حوالے سے عرش اور فرش ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ جس قدر فرش نیچے ہے اسی قدر عرش اوپر ہے۔

کسی اصل میں شریک ہوں اور سب ایک ہی اصل کی طرف منسوب ہوں اور یہ تمام اس اصل کی فروعات اور اجزاء ہوں، اور ثابت ہو چکا ہے کہ نہ اللہ تعالیٰ سے پہلے کوئی چیز ہے، نہ وہ کسی اصل کا محتاج ہے۔

۱۴ سوال ۱۴

اللہ تعالیٰ قدیم (Eternal) ہے یا حادث (Ephemeral)؟

۱۴ جواب ۱۴

اللہ تعالیٰ قدیم ہے، کیونکہ قدیم اس کو کہتے ہیں جس سے پہلے عدم (Non-Existence) نہ ہو اور وہ اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہ ہو، اور پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بذاتہ موجود ہے اور اپنے وجود میں کسی سبب کا محتاج نہیں اور جس چیز کا وجود عدم کے بعد ہو، وہ ضرور اپنے وجود میں کسی سبب کی محتاج ہوا کرتی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ قدیم ہے۔

۱۵ سوال ۱۵

کیا اللہ تعالیٰ حرکت وسکون سے متصف ہو سکتا ہے؟

۱۵ جواب ۱۵

نہیں، اس لئے کہ:-

{الف} حرکت سے وہ شے متصف ہو سکتی ہے جو زمانی (Temporal) ہو کیونکہ حرکت کی تعریف یہ ہے ''کسی شے کا آنِ ثانی (Next Moment) میں آنِ اول (Previous Moment) کی حالت سے مختلف ہونا'' اور سکون کی تعریف یہ ہے ''کسی شے کا آنِ ثانی میں بھی آنِ اول کی حالت پر ہونا۔

پھر ''آن'' وقت کے ایک جزو کو کہا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ وقت سے فوق الفوق اور بالاتر ہے، اس لئے کہ وقت سورج کی حرکت اور رفتار سے بنتا ہے، اور اللہ تعالیٰ چونکہ تمام موجودات سے پہلے ہے اور تمام کرات (Spheres) کا خالق ہے، اس لئے وہ وقت سے متصف نہیں ہوسکتا، لہٰذا وہ حرکت سے بھی موصوف نہیں ہوسکتا۔

{ب} حرکت میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال وتغیر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ تغیر سے پاک ہے، لہٰذا حرکت سے متصف نہیں ہوسکتا۔

{ج} حرکت جبری ہوتی ہے یا اختیاری۔ اللہ تعالیٰ کے لئے جبری حرکت ناممکن ہے اس لئے کہ اسے کوئی چیز مجبور نہیں کرسکتی، اور حرکتِ اختیاری کسی شے کو حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچنے کے لئے ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کسی شے کا محتاج نہیں ہے، لہٰذا اس کے لئے حرکتِ ارادی بھی ثابت نہیں ہوسکتی۔

اور سکون سے اس لئے متصف نہیں ہوسکتا کہ سکون سے وہ شے متصف ہوسکتی ہے جو قابلِ حرکت (Movable) ہو مگر بالفعل متحرک (Actually moving) نہ ہو۔ اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ متحرک ہونا اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اس لئے وہ سکون سے بھی متصف نہیں ہوسکتا۔

۱۶ سوال ۱۶

اللہ تعالیٰ کب سے ہے اور کب تک رہے گا؟

۱۶ جواب ۱۶

اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسا سوال کرنا غلطی ہے کیونکہ ایسا سوال ان اشیاء کے

متعلق کیا جا سکتا ہے جو زمانی ہوں، یعنی حرکات کرویہ (Spherical motion) کے زیرِ اثر ہوں اور ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام حرکات کرویہ سے مافوق (above) اور غیر زمانی ہے (Non-temporal) ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، نہ اس کی ابتدا ہے اور نہ ہی انتہا۔

سوال ۱۷

کیا اللہ تعالیٰ کھانے پینے سے منزہ ہے یا اسے بھی کھانے پینے کی ضرورت ہے؟

جواب ۱۷

اللہ تعالیٰ کو کھانے پینے کی قطعاً ضرورت نہیں؛ بلکہ یہ تصور ہی سرے سے باطل ہے۔ کیونکہ غذا تحلیل اور ہضم ہونے کے بعد اس شے کی جز بن جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ بسیط (incorporeal) ہے، اس کے اجزاء نہیں جیسا کہ پہلے ثابت ہو چکا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ بچپن، جوانی اور بڑھاپے، غم اور شادی، خطا اور نسیان اور غفلت وتھکاوٹ وغیرہ تمام متغیر صفات سے پاک ہے۔ اس لئے کہ ہر تغیر کسی مؤثر (Effective) اور سبب کی وجہ ہوتا ہے اور مختلف تغیرات کے لئے مختلف مؤثرات اور علل (Causes) ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً حرکت کے اور اسباب ہیں، سکون کے اور۔ ایسے ہی غم کے اور خوشی کے اور --- اسی طرح سب میں سمجھنا چاہیے۔

اب اگر اللہ تعالیٰ میں یہ متغیر صفات اور مختلف تغیرات پائے جائیں تو ضرور ان اختلافات وتغیرات کے اسباب اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور اشیاء ہوں گی۔ جس سے لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ دیگر اسباب سے متاثر ہو، اور یہ محال ہے۔ کیونکہ متاثر ہونا ضعف کی علامت ہے۔ جو شے قوی ہو وہ مؤثر کی قوت کا مقابلہ کرتی ہے اور اس کی تاثیر سے متاثر نہیں ہوتی۔ اور پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب قویٰ (Faculties) کا موجد

(Creator) اور سب میں مؤثر ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کا کسی علت و مؤثر سے متاثر ہونا محال و ناممکن ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ میں متغیر صفات کا پایا جانا غیر ممکن ہے۔

سوال ۱۸

کیا اللہ تعالیٰ پر نیند یا غنودگی وغیرہ طاری ہوسکتی ہے؟

جواب ۱۸

نہیں، اس لئے کہ :-

{الف} نیند سے غفلت پیدا ہوتی ہے اور یہ عیب ہے؛ جبکہ اللہ تعالیٰ سب عیبوں سے پاک ہے۔

{ب} نیند رطوباتِ بخاریہ (Vaporized Fluids) کے دماغ میں پہنچنے سے ہوتی ہے، اور یہ جسمانی کیفیات ہیں اور ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسمانی صفات سے متصف نہیں ہوسکتا۔

{ج} نیند تھکان دور کرنے کے لئے ہوتی ہے، جو بدن کو متعدد حرکات کی وجہ سے لاحق ہوجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ تھکان اور حرکت سے پاک ہے۔

قرآن شریف میں ہے

﴿ لَاتَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ﴾ [البقرۃ، آیۃ ۲۵۵]

﴿نہ اس پر غنودگی طاری ہوتی ہے اور نہ نیند﴾

سوال ۱۹

کیا اللہ تعالیٰ علم، ارادہ اور قدرت رکھتا ہے؟

۱۹ جواب ۱۹

ضرور، اس لئے کہ :-

{الف} جو شے علم و ارادہ اور قدرت نہ رکھتی ہو، اس میں حسنِ تدبیر اور انتظامی قابلیت کیسے ہوسکتی ہے؟ کسی بھی کام کو سرانجام دینے کے لئے پہلے اس کام کا علم ہوتا ہے، بعدہٗ اسے کرنے کا ارادہ ہوتا ہے، اس کے بعد عمل ہوتا ہے۔

انسان کی حالت کو ذرا دیکھئے، کہ بچپن کی حالت میں جب یہ تینوں اوصاف اس میں ضعیف ہوتے ہیں تو یہ کسی انتظام اور تدبیر کی صلاحیت نہیں رکھتا اور ہر طرح سے عاجز اور غیروں کا محتاج ہوتا ہے، اور جب رفتہ رفتہ اس میں یہ اوصاف قوی ہوتے جاتے ہیں تو اپنے حسنِ انتظام اور تدبیر سے بہتر سے بہتر کام انجام دیتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس عمدہ نظام کا منتظم اللہ تعالیٰ نہایت صحیح علم، قوی ارادہ اور وسیع قدرت رکھتا ہے۔

{ب} اس عالم کے تمام محاسن و کمالات اس کی عنایت سے ہیں، جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا ہے۔ اور اس عالم میں علم، ارادہ اور قدرت والی مخلوقات موجود ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جس ذات کی طرف سے علم و ارادہ وغیرہ کمالات کے خزانے اوروں کو عطا ہوتے ہوں، وہی ذات خود ان کمالات و محاسن سے محروم ہو؟

{ج} اگر اللہ تعالیٰ علم و ارادہ اور قدرت سے متصف نہ ہو تو صفاتِ کمالیہ سے خالی ہوگا اور بجائے ان صفات کے صفات نقص، یعنی جہالت اور مجبوری کے ساتھ موصوف ہوگا۔ حالانکہ پہلے واضح ہو چکا ہے کہ وہ تمام صفات کمالیہ کا جامع اور ہر عیب سے پاک ہے۔

سوال ۲۰

کیا اللہ تعالیٰ کے لئے حیات ہے؟

جواب ۲۰

ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ ذی علم، ذی ارادہ اور ذی قدرت ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بے حیات شے ان صفات سے متصف نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا وہ ضرور ذی حیات ہے لیکن اس کی حیات ہماری حیات کی طرح نہیں ہے کہ اس کے اندر ہماری طرح روح ہو اور وہ اپنی حیات میں روح کا محتاج ہو؛ بلکہ وہ بذاتہٖ حی و قیوم ہے۔ بطور تفہیم روح کو دیکھئے کہ وہ مردہ نہیں زندہ ہے، مگر جسم کی طرح اپنی زندگی میں کسی اور چیز کی محتاج نہیں ہے۔

سوال ۲۱

جو علوم بذریعہ حواسِ جسمانیہ (Body Senses) حاصل ہوا کرتے ہیں، جیسے دیکھنا، سونگھنا، چکھنا، سننا اور چھونا وغیرہ، یہ اللہ تعالیٰ کو کیسے حاصل ہو سکتے ہیں؟ کیونکہ وہ جسم نہیں ہے کہ اس کے لئے یہ جسمانی حواس ہوں اور یہ بات بھی تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ اللہ تعالیٰ کو ان کا علم حاصل نہ ہو، کیونکہ اس صورت میں انسان علم کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ سے افضل ہو جائے گا اور یہ ناممکن ہے؟

جواب ۲۱

ہماری روح چونکہ قفسِ بدن کے اندر مقید ہے، اس لئے اسے جزئیات کے معلوم کرنے کے لئے جسمانی حواس کی ضرورت رہتی ہے اور حواسِ خمسہ کے بغیر اسے کوئی جزوی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ ہمارا حال ہے، اللہ تعالیٰ کا حال اس پر قیاس

نہیں کیا جا سکتا کیونکہ علم قیاس (Syllogism) میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ مقیس (The Inferred) اور مقیس علیہ (The Inferring) کے درمیان اتحاد اور علتِ جامعہ (Relation & Distributed cause) کا ہونا ضروری ہے، ورنہ قیاس کرنا صحیح نہ ہو گا۔ اور ظاہر ہے کہ ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی علتِ جامعہ نہیں ہے اور نہ کسی وجہ سے اتحاد ہے۔ ہم جسمانی ہیں اس لئے ہم جسمانی حواس کے محتاج ہیں۔ ہم مختلف عناصر سے مرکب ہیں اس لئے ہم کو مختلف حواس کی ضرورت ہے، اور اللہ تعالیٰ نہ جسمانی ہے اور نہ مختلف عناصر سے مرکب ہے۔ اس لئے اسے ان میں سے کسی کی ضرورت یا احتیاج نہیں ہے۔

نیز ہم چونکہ اپنے وجود کے لحاظ سے غیر کے محتاج ہیں اس لئے اپنے باقی اوصاف کی تحصیل میں بھی اسباب و آلات کے محتاج ہیں کیونکہ وجود اصل (Root) ہے اور اوصاف اس کے فرع (Offshoot) اور اصل کا احتیاج، فرع کے احتیاج کا موجب ہوا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے وجود میں کسی سبب کا محتاج نہیں ہے اس لئے علم وغیرہ اوصاف میں بھی کسی سبب اور ذریعہ کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی ایک ذات ہی تمام اوصاف کمالیہ کا خزینہ و سرچشمہ ہے اور ایک ہی بسیط (Incorporeal) اور واحد محض ذات اپنی ضعیف مخلوق، مثلاً چیونٹی سے لے کر --- اگرچہ وہ تحت الثریٰ (Lowest Region) میں یا سخت پتھر کے اندر ہو --- اپنی قوی مخلوق، مثلاً شیر اور ہاتھی تک کی آواز اور فریاد ایک ہی طرح سنتی ہے، لیکن بغیر اس کے کہ کانوں کی محتاج ہو۔ یوں ہی سب چھوٹی اور بڑی اشیاء کو دیکھتی ہے، لیکن ہماری طرح آنکھوں کی محتاج نہیں --- ایسے ہی اس کے تمام علوم کو یقین کر لیجئے۔

سوال ۲۲

کسی شے کا علم تین طرح سے حاصل ہوسکتا ہے۔

{۱} وہ شے خود بنفسہٖ عقل میں آجاتی ہے۔

{۲} اسکے اجزاء معلوم ہونے سے اس کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے، جیسے سکنجبین، کہ جب اس کے اجزاء، یعنی شہد اور سرکہ اور ان کے آپس میں ملانے کا علم حاصل ہو جائے تو سکنجبین کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

{۳} کبھی کسی چیز کا علم اس کے اوصاف خارجیہ اور کیفیات کے ذریعہ حاصل ہؤا کرتا ہے، جیسے عام طور پر جو اشیاء ہم نے دیکھی نہیں ہیں، ان کا علم ان کے اوصاف اور آثار کے ذریعہ سے ہمیں حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کا علم حاصل کرنا چاہیں تو ان تین صورتوں میں سے کون سی صورت سے ہمیں حاصل ہوسکتا ہے؟

جواب ۲۲

ہمیں اللہ تعالیٰ کا علم اس کے آثار و اوصاف کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے۔ باقی دونوں صورتیں ناممکن ہیں، کیونکہ نہ تو انسانی عقل اس کی نفس ذات کا ادراک کر سکتی ہے، نہ اس کے لئے اجزاء ہیں کہ ان کے ذریعہ اس کی حقیقت معلوم کی جا سکے۔

سوال ۲۳

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی مجموعی تعداد کیا ہے؟

جواب ۲۳

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کو مکمل طور پر بیان کرنا انسانی قوت سے باہر ہے کیونکہ انسانی عقل محدود ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات کے لحاظ سے ہر طرح غیر محدود ہے اور محدود، غیر محدود کا احاطہ نہیں کرسکتا؛ البتہ بطور اجمال عارفِ اکبر ﷺ

نے جو صفات بیان فرمائی ہیں ان میں سے چند ایک بیان کی جاتی ہیں۔ جن کو دل کے اندر جمانے سے عقیدہ پختہ اور دل منور ہو جاتا ہے اور ان کے ورد کرنے سے انسان جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان کی تعداد ننانوے (99) ہے، جو مختصر تشریح کے ساتھ درج ذیل ہیں۔

اَللّٰهُ

معبود، تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع اور تمام عیوب سے منزہ۔ اس نام کو اسم ذات اور باقی سب کو صفات کہا جاتا ہے۔

۱ اَلرَّحْمٰنُ

دنیا میں تمام مخلوقات پر رحم کرنے والا۔ اس لئے کہ وہ سب کا خالق ہے اور سب ہر لحاظ سے اسکے محتاج ہیں ①

۲ اَلرَّحِیْمُ

بروز قیامت اپنے نیک بندوں پر رحم کرنے والا۔ اس لئے کہ وہ سزا و جزا کا دن ہوگا جب بندوں کو اعمال حسنہ کی جزا ملے گی ②

---

①← اللہ تعالیٰ تمام بندوں کی دنیاوی ضروریات محض اپنی رحمت سے پوری کرتا ہے اور دنیا چونکہ دارِ جزا وسزا نہیں ہے اس لئے دنیا میں اس کی رحمت سب کے لئے عام ہے جس میں مسلم و منکر کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ "رحمانیت" کا تعلق اسی عمومی رحمت سے ہے۔

②← یہ بھی محض اس کی رحمت ہے۔ اس پر بندوں کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اپنی عبادت کی وجہ سے اس جزا کا مطالبہ کریں۔ اس لئے کہ جو بندہ دنیا میں عبادت کرتا ہے وہ ہمہ وقت اس کی نعمتوں کو استعمال کرتا ہے۔ دنیاوی نعمتوں کا معاوضہ بھی اس کی عبادت نہیں ہو سکتی، اخروی نعمتیں کجا۔ "رحیمیت" کا تعلق اس خصوصی رحمت سے ہے جو نیک بندوں کو آخرت میں حاصل ہوگی ﴿﴾

۳ اَلْمَلِکُ

بادشاہ۔ ہر چیز کا وجود اس کے اختیار میں ہے اور اسے ہر طرح کا تصرفِ کامل حاصل ہے۔

٤ اَلْقُدُّوسُ

سب عیبوں سے پاک اور ہر قسم کی خامی سے مبرا ومنزہ۔

٥ اَلسَّلَامُ

مخلوق کو سلامتی اور امن دینے والا۔

٦ اَلْمُؤْمِنُ

تصدیق کرنے والا۔ یعنی اپنے بھیجے ہوئے رسولوں کی تصدیق کرنے والا۔

٧ اَلْمُهَيْمِنُ

حفاظت کرنے والا اور بندوں کے اعمال کو کمی وزیادتی سے محفوظ رکھنے والا اور قیامت کے دن ان کی پوری جزا دینے والا۔ ①

٨ اَلْعَزِيْزُ

ہر چیز پر غالب۔ تمام کائنات اس کے سامنے مغلوب اور بے بس ہے۔

٩ اَلْجَبَّارُ

جبر کرنے والا۔ تمام مخلوقات اس کے ارادے کے آگے مجبور ہے اور پوری

---

①← یعنی بدکاروں کی بداعمالی کی سزا زائد نہیں ہوگی؛ بلکہ اگر چاہے گا تو سزا دینے میں بہت کمی کردے گا اور نیکوں کو ان کی نیکیوں کا معاوضہ کم نہیں دے گا؛ بلکہ بہت زیادہ دے گا۔

کائنات میں کسی کو اس کے تکوینی نظام سے سرتابی کی مجال نہیں۔ اور اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ زخمی دلوں پر اپنی رحمتِ کاملہ سے مرہم رکھنے والا اور صدموں سے نجات دینے والا۔

۱۰ اَلْمُتَکَبِّرُ

سب سے بڑا۔ تمام اشیاء اس کی کبریائی کے آگے ہیچ ہیں۔ اپنی بڑائی کا اظہار کرنے والا۔

۱۱ اَلْخَالِقُ

پیدا کرنے والا۔ ہر موجود کی ہر حرکت وسکون کا خالق وہی ہے ①

---

①← اس مقام پر بندوں کے افعال کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بندہ خود اپنے افعال کا خالق ہے، جیسے معتزلہ کی یہی رائے ہے۔ اور جبریہ کہتے ہیں کہ بندہ مجبورِ محض ہے۔ اس میں اور پتھر کی حرکت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ دونوں مذاہب باطل ہیں۔ اس لئے کہ بندہ بارہا بعض افعال کا مصمم ارادہ کرتا ہے مگر وہ اس سے صادر نہیں ہو پاتے اور بارہا بلا ارادہ افعال اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بندہ اپنے افعال میں مستقل الاختیار نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ بندہ جب اپنے وجود میں مستقل نہیں تو افعال میں، جو وجود کے تابع ہیں، کیسے مستقل ہو سکتا ہے؟ قرآن پاک میں صاف موجود ہے کہ

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ [الصّٰفّٰت، آیۃ۹۶]

﴿اللہ تعالیٰ نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا فرمایا ہے﴾

لہٰذا بندہ کو اپنے فعل میں خودمختار کہنا ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔

جبریہ کے قول کا باطل ہونا بھی ظاہر ہے، کیونکہ کسی عاقل پر یہ بات مخفی نہیں کہ پتھر وغیرہ جمادات کے لڑھکنے کی حرکت اور انسان کی حرکات میں واضح فرق ہے۔ اسی طرح رعشہ کے مریض اور بخار والے انسان کے لرزنے کی حرکت اور تندرست انسان کی حرکات میں فرق ظاہر ہے۔ ☜

﴿۱۲﴾ اَلْبَارِئُ

بلاعیب اپنے ہر فعل میں۔اور بندوں کو عیبوں سے پاک کرنے والا۔

﴿۱۳﴾ اَلْمُصَوِّرُ

اشیاء کو مختلف صورتیں عنایت کرنے والا، تاکہ ان میں امتیاز ہو، اور التباس واشتباہ واقع نہ ہو۔

﴿۱۴﴾ اَلْغَفَّارُ

بندوں کے گناہ بار بار بخشنے والا، اگر وہ شرک نہ کریں اور توبہ کریں۔اگر چاہے تو بلاتوبہ بھی بخش دے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾

[النسآء، آیة ۴۸ اور ۱۱۶]

﴿ اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے، اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کردے ﴾

﴿۱۵﴾ اَلْقَهَّارُ

قہر کرنے والا اپنی نافرمان مخلوق پر، جو ہر قسم کے اسباب ہدایت حاصل

لہٰذا یہ دونوں مذاہب افراط (Inflation) تفریط (Deflation) پر مبنی ہیں۔اس مسئلہ میں صحیح مذہب علماءِ اشاعرہ کا ہے۔اور وہ یہ ہے کہ بندہ نہ مجبور محض ہے اور نہ مختارِ مطلق؛ بلکہ ایک لحاظ سے، یعنی ظاہر حالت کے لحاظ سے مختار ہے، جس کی وجہ سے اچھائی برائی اور ثواب وعقاب اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔اور ایک لحاظ سے، یعنی باطنی حالت کے لحاظ سے غیر مختار ہے۔اپنی ہر حرکت وسکون میں اللہ تعالیٰ کے ارادے کا محتاج ہے۔اسی متوسط حالت کا نام کسب (Acquisition) ہے اور بندہ کو اس کی وجہ سے کاسب کہا جاتا ہے، نہ کہ خالق۔

ہونے کے بعد بھی راہ ہدایت پر نہ آئے اور انکار کرے۔

۱۶ اَلْوَهَّابُ

بلا استحقاق انواع واقسام کی بخششیں کرنے والا۔

۱۷ اَلرَّزَّاقُ

رزق دینے والا۔ جس چیز کا جتنا رزق اس نے مقرر کیا ہے اس سے نہ بڑھ سکتا ہے، نہ گھٹ سکتا ہے ①

۱۸ اَلْفَتَّاحُ

رزق ورحمت کے دروازے کھولنے والا۔ مشکلات حل کرنے والا۔

---

①← بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رزق کی کمی بیشی انسان کے اختیار میں ہے۔ اگر کوئی صاحبِ کمال اور ہنر مند ہو تو اس کا رزق فراخ اور وسیع ہوتا ہے اور بے کمال ہو تو اس کا رزق کم اور تنگ ہوتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ کتنے نالائق اور بے ہنر، زمانہ سابقہ سے اب تک بادشاہ اور صاحب حکومت چلے آتے ہیں اور کتنے بڑے بڑے عقلا اور اہل کمال دربدر پھرتے ہیں اور ان کا کمال کسی کام نہیں آتا۔

اوفتاد است در جہاں بسیار   بے تمیز ارجمند و عاقل خوار

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم بیکار ہو کر بیٹھ جائیں۔ اس لئے کہ دنیا عالم اسباب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو دوسری چیز سے مربوط کیا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء دیئے ہیں، اگر ان اسباب سے کام لینا مقصود نہ ہوتا تو پیدا ہی کیوں کیے جاتے؟ اسی لئے انبیاء علیہم السلام نے حسبِ ضرورت اپنا ذریعہ معاش کوئی نہ کوئی اختیار فرمایا ہے۔ مثلاً حضرت آدمؑ زراعت اور حضرت داؤدؑ زرہ سازی کا کام کرتے تھے۔

۱۹ اَلْعَلِيْمُ

جاننے والا۔ آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز، کہیں بھی اس سے مخفی نہیں۔ ①

۲۰ اَلْقَابِضُ

حسب مصلحت رزق تنگ کرنے والا۔

۲۱ اَلْبَاسِطُ

حسب مصلحت رزق وسیع کرنے والا۔

۲۲ اَلْخَافِضُ

حسبِ مصلحت بلند رتبہ والوں کو پست کرنے والا۔

۲۳ اَلرَّافِعُ

حسبِ مصلحت پست مرتبہ والوں کو رفعت دینے والا۔

۲۴ اَلْمُعِزُّ

عزت دینے والا۔ دنیا میں بسبب غلبہ اور فتح وغیرہ کے اور آخرت میں

---

①← اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہوسکتی کیونکہ

{الف} علم صفت کمال ہے اور پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع ہے۔

{ب} کسی چیز کا مخفی رہنا حجاب کی وجہ سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی شے حجاب نہیں بن سکتی، کیونکہ تمام موجودات اس کے وجود کی نسبت معدوم (Non-Existent) ہیں اور معدوم وجود کے آگے حجاب نہیں ہوسکتا۔

{ج} دیگر موجودات ہر حال میں اپنی بقاء کے لئے اس کی محتاج ہیں اور اس کی تاثیر ہر حال میں ان میں جاری ہے اور مؤثِر (Effective) اور مؤثَر (Effected) کے مابین حالتِ تاثیر میں حجاب ناممکن ہے، ورنہ تاثیر منقطع ہو جائے گی۔

جنت میں داخل کرنے کی وجہ سے۔

۲۵ اَلْمُذِلُّ

ذلت دینے والا۔ جسے چاہے دنیا اور آخرت میں ناپسندیدہ اعمال کی وجہ سے رسوا کردے۔

۲۶ اَلسَّمِیْعُ

ہر آواز کو سننے والا، خواہ چیونٹی کی ہو، یا مچھر کی، یا اس سے بھی چھوٹی چیز کی۔

۲۷ اَلْبَصِیْرُ

ہر ادنیٰ و اعلیٰ چھوٹی بڑی چیز کو دیکھنے والا۔ لیکن اس کی سمع و بصر ہماری طرح کان اور آنکھ کی محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ یہ جسمانی آلات ہیں اور وہ جسم سے پاک ہے۔

۲۸ اَلْحَکَمُ

ہر حال میں قوی اور محکم اور صحیح فیصلہ کرنے والا۔

۲۹ اَلْعَدْلُ

ہر قول و فعل میں کامل عدل والا۔

۳۰ اَللَّطِیْفُ

اپنے بندوں کی حاجتوں کو ایسے نامعلوم طریقہ سے پورا کرنے والا کہ ان کو گمان بھی نہ ہو۔

۳۱ اَلْخَبِیْرُ

ہر حال میں، ہر شے سے، ہر حیثیت سے باخبر رہنے والا۔

۳۲ اَلْحَلِيْمُ

بردبار، نافرمان بندوں کوسزا دینے میں تاخیر کرنے والا، توبہ کا موقع دینے والا۔

۳۳ اَلْعَظِيْمُ

بڑی شان والا، جس کے ادراک سے سب عقول عاجز ہیں۔

۳٤ اَلْغَفُوْرُ

بہت زیادہ معاف کرنے والا اور گناہ بخشنے والا۔

۳٥ اَلشَّكُوْرُ

بہت عمدہ بدلہ دینے والا اور بندوں کا شکر قبول کرنے والا۔

۳٦ اَلْعَلِيُّ

اپنی ذات وصفات کے لحاظ سے بلند و بالا۔

۳۷ اَلْكَبِيْرُ

بڑا۔ تمام مخلوقات اس سے حقیر اور کمتر ہیں۔

۳۸ اَلْحَفِيْظُ

شیطانی اثرات سے بندوں کی حفاظت کرنے والا اور حسبِ مصلحت مخلوق کو مصائب سے محفوظ رکھنے والا۔

۳۹ اَلْمُقِيْتُ

ہر چیز کو اس کی ضرورت کے مطابق غذا پہنچانے والا۔

٤٠ اَلْحَسِيْبُ

تمام اشیاء کو بلا حساب وشمار کے دفعۃً پورے طور پر جاننے والا۔

[٤١ اَلْجَلِیْلُ]

عظمت والا۔ ہر اونچی چیز اس کے آگے جھکی ہوئی ہے اور ہر بڑی چیز اس کے سامنے چھوٹی ہے۔

[٤٢ اَلْکَرِیْمُ]

بلا استحقاق اپنی مخلوق پر کرم و بخشش کرنے والا۔

[٤٣ اَلرَّقِیْبُ]

نگہبانی کرنے والا اور مخلوق کے انتظام کو ہر قسم کے خلل سے محفوظ رکھنے والا۔

[٤٤ اَلْمُجِیْبُ]

حسب مصلحت دعائیں قبول کرنے والا۔

[٤٥ اَلْوَاسِعُ]

وسیع معلومات اور قدرت رکھنے والا۔

[٤٦ اَلْحَکِیْمُ]

ہر قول و فعل حکمت و مصلحت کے مطابق کرنے والا۔

[٤٧ اَلْوَدُوْدُ]

اپنے بندوں سے محبت کرنے والا اور اپنے خاص بندوں کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈالنے والا۔

[٤٨ اَلْمَجِیْدُ]

بزرگی والا اور دوسروں کو بزرگی عنایت کرنے والا۔

٤٩ اَلُبَاعِثُ

اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے انبیاءؑ کو بھیجنے والا اور بروزِ قیامت سزا و جزا کے لئے مُردوں کو قبروں سے اٹھانے والا۔

٥٠ اَلشَّہِیدُ

تمام موجودات کو اپنے علم میں حاضر رکھنے والا۔

٥١ اَلُحَقُّ

جس کا وجود حقیقی ہے اور جس کا ہر فعل درست ہے۔

٥٢ اَلُوَکِیلُ

تمام مخلوقات کی ضروریات کو مہیا کرنے کا ذمہ لینے والا۔

٥٣ اَلُقَوِیُّ

قوت والا، جس کی قوت و طاقت کی کوئی انتہا نہیں۔

٥٤ اَلُمَتِینُ

نہایت مضبوط۔ ہر خلل و تغیر سے بلند اور ہر کمزوری سے پاک۔

٥٥ اَلُوَلِیُّ

اپنے نیک بندوں کو دوست رکھنے والا اور ان کو اپنا قرب عطا کرنے والا۔

٥٦ اَلُحَمِیدُ

قابل ستائش و حمد، اور غیروں کو قابلِ ستائش بنانے والا۔

۵۷ اَلْمُحْصِیُ

ہر چیز کے اندازے کو پورے طور پر جاننے والا۔

۵۸ اَلْمُبْدِئُ

ہر چیز کو ابتدائی وجود سے موجود کرنے والا۔

۵۹ اَلْمُعِیْدُ

ابتدائی وجود کو فنا کرنے کے بعد دوسرا وجود عطا کرنے والا۔

۶۰ اَلْمُحْیِیُ

زندگی بخشنے والا، اور مردہ دلوں کو ہدایت دے کر زندہ کرنے والا۔

۶۱ اَلْمُمِیْتُ

مارنے والا مقرر وقت پر، جس میں تقدیم وتاخیر نہیں ہوتی۔

۶۲ اَلْحَیُّ

بذاتِ خود زندہ۔ اپنی زندگی میں کسی کا محتاج نہیں۔

۶۳ اَلْقَیُّوْمُ

خود قائم اور ثابت اور دوسروں کو قیام وثبوت دینے والا۔

۶۴ اَلْوَاجِدُ

ہر چیز کو پالینے والا۔ کوئی چیز اس کی دسترس سے باہر نہیں نکل سکتی۔

۶۵ اَلْمَاجِدُ

بزرگی والا۔ بلند مرتبہ۔

٦٦ اَلْوَاحِدُ

اپنی صفات میں یکتا۔ جس کا کوئی شریک نہیں۔

٦٧ اَلْاَحَدُ

اپنی ذات میں یکتا۔ جنس اور کفو سے بالکل پاک۔

٦٨ اَلصَّمَدُ

تمام مقاصد اور حوائج کا ملجاء و منتہیٰ۔ سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔

٦٩ اَلْقَادِرُ

ذاتی قدرت والا اور ہر چیز کا اندازہ مقرر کرنے والا۔

٧٠ اَلْمُقْتَدِرُ

نہایت مکمل اور اتم قدرت والا۔

٧١ اَلْمُقَدِّمُ

وجود اور دیگر کمالات میں سبقت دینے والا۔

٧٢ اَلْمُؤَخِّرُ

مناصب اور کمالات سے پیچھے ہٹانے والا۔

٧٣ اَلْاَوَّلُ

سب سے پہلے۔ تمام اشیاء کی ابتدا اسی سے ہے اور خود اس کی کوئی ابتدا نہیں۔

٧٤ اَلْاٰخِرُ

سب کے بعد اور سب کی انتہا، لیکن اس کی کوئی انتہا نہیں۔

۷۵ اَلظَّاهِرُ

اپنے آثار وصفات کے لحاظ سے ظاہر۔

۷۶ اَلْبَاطِنُ

کبریا اور عظمت کے حجاب میں مستور اور پوشیدہ۔

۷۷ اَلْوَالِیُ

کامل تصرف وقدرت والا۔ کوئی اس کا مزاحم ومقابل نہیں ہوسکتا۔

۷۸ اَلْمُتَعَالِ

مخلوقات کی صفات وکیفیات سے بلند وبالا۔

۷۹ اَلْبَرُّ

نیک بندوں کے اعمال کی جزا دگنی؛ بلکہ بہت زیادہ دینے والا اور برے بندوں کی بداعمالیوں سے درگذر کرنے والا۔

۸۰ اَلتَّوَّابُ

گنہگار بندوں کی بار بار توبہ قبول کرنے والا۔

۸۱ اَلْمُنْتَقِمُ

سرکشوں کو سخت عذاب دینے والا۔

۸۲ اَلْعَفُوُّ

مجرم بندوں کے جرم سے درگذر کرنے والا۔

۸۳ اَلرَّءُوْفُ

مہربان اور اپنے احکام میں نرمی اور سہولت کو پسند کرنے والا۔

﴿۸٤ مَالِکُ الْمُلْکِ﴾

ملک کا مالک، کائنات کی ہر شئے اس کی ملکیت میں داخل ہے۔

﴿۸۵ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ﴾

بہت جلال اور عظمت والا۔ جس کے جلال اور ہیبت کے آگے ہر شئے سرنگوں ہے۔

﴿۸٦ اَلْمُقْسِطُ﴾

مخلوق کے لئے اپنے دریائے رحمت سے حسبِ مصلحت عدل وانصاف سے حصے مقرر کرنے والا۔

﴿۸۷ اَلْجَامِعُ﴾

تمام کمالات کا احاطہ کرنے والا اور قیامت کے دن مُردوں کے تمام اجزاء کو، خواہ وہ کہیں بھی ہوں، ایک جگہ جمع کرنے والا۔

﴿۸۸ اَلْغَنِیُّ﴾

ہرطرح کی محتاجی سے پاک۔ مخلوقات اس کی محتاج ہے اور وہ غنی بادشاہ ہے۔

﴿۸۹ اَلْمُغْنِیُ﴾

محتاجی دور کرنے والا اور غیر خدا کے احتیاج سے اپنے بندوں کو بے پرواہ کرنے والا۔

﴿۹۰ اَلْمَانِعُ﴾

حسبِ مصلحت بندوں کو خواہشوں سے روکنے والا اور ان کے اسباب ومساعی کو ناکام بنانے والا۔

۹۱ اَلضَّآرُّ

حسبِ مصلحت بندوں کو ان کی خواہشوں سے کم دینے والا۔

۹۲ اَلنَّافِعُ

بندوں کو ان کے تقاضوں سے بڑھ کر دینے والا۔ نفع پہنچانے والا۔

۹۳ اَلنُّوْرُ

زمین و آسمان کو روشنی عطا کرنے والا اور تمام اشیاء کو ظلمتِ عدم سے نورِ وجود میں لانے والا اور دلوں کو کفر و فسق کی ظلمت سے پاک کر کے نورِ معرفت و ہدایت سے منور کرنے والا۔

۹۴ اَلْهَادِیْ

ہر مخلوق کو اس کی مناسب ضرورت کی طرف رہنمائی کرنے والا اور اپنے قرب کا راستہ دکھانے اور مقصد تک پہنچانے والا۔

۹۵ اَلْبَدِیْعُ

نقشہ و مثال کے بغیر آسمانوں اور زمین اور دیگر کائنات کو پیدا کرنے والا۔

۹۶ اَلْبَاقِیْ

ہمیشہ ایک ہی حال میں رہنے والا، تغیر و فنا سے پاک۔

۹۷ اَلْوَارِثُ

سب مجازی مالکوں کے فنا ہونے کے بعد حقیقی مالک کے طور پر موجود رہنے والا۔

۹۸ اَلرَّشِیْدُ

بندوں کی ہدایت کے لئے مختلف اور آسان اسباب پیدا کرنے والا۔

[۹۹ اَلصَّبُوْرُ]

بندوں کو صبر کی توفیق دینے والا اور اس پر اجر دینے والا، اور نافرمانوں سے اپنے عذاب کو مقرر وقت تک روکنے والا اور حسبِ مصلحت ہر ایک کو ایک مقرر حد کے اندر رکھنے والا۔

***

یہ ننانوے اسمائے الٰہیہ تو حدیث میں یکجا مذکور ہیں اور ان کا ورد کرنے والوں اور یاد رکھنے والوں کو رسول اللہ ﷺ نے جنت کا مژدہ سنایا ہے۔ ان اسماء کے علاوہ بھی قرآن و سنت میں متعدد اسماء کا ذکر ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

***

[۱۰۰ اَلْمُنْعِمُ]

مخلوق کو اپنی نعمتوں سے سرفراز کرنے والا۔

[۱۰۱ اَلْمُعْطِی]

حسبِ مصلحت بندوں کو نعمتیں عطا کرنے والا۔

[۱۰۲ اَلرَّبُّ]

کسی امیدِ منفعت کے بغیر پرورش کرنے والا۔

[۱۰۳ اَلْفَاطِرُ]

ملی ہوئی چیزوں کو شق اور جدا کرنے والا، جیسے گٹھلی سے نباتات نکالنے والا۔

[۱۰۴ اَلرَّفِیْعُ]

اپنی قدر و منزلت کے لحاظ سے بہت بلند، اونچے مرتبے اور شان والا۔

۱۰۵ اَلدَّائِمُ

ہمیشہ رہنے والا۔ جب کچھ نہیں تھا تب بھی وہ موجود تھا اور جب کچھ نہیں رہے گا تب بھی موجود ہوگا۔

۱۰۶ اَلْجَوَّادُ

بے حد اور بے حساب عطا کرنے والا، سخی۔

۱۰۷ اَلْقَدِیْرُ

ذاتی قدرت سے ہر شے پر قدرت اور تصرف رکھنے والا۔

۱۰۸ اَلشَّافِیُ

ظاہری اور باطنی امراض سے شفاء دینے اور اس کے اسباب پیدا کرنے والا۔

۱۰۹ اَلْحَنَّانُ

نرمی کرنے والا اور نرمی کو پسند کرنے والا۔ بندوں کی آہ وزاری اور اشتیاق کو قبول کرنے والا۔

۱۱۰ اَلْمَنَّانُ

بہت احسان کرنے والا اور احسان کی طرف بندوں کو توجہ دلانے والا۔

۱۱۱ اَلْمُبِیْنُ

مخلوقات سے ہر حیثیت سے ممتاز وجدا اور ہدایت کے راستے کا بیان کرنے والا۔

۱۱۲ اَلْمُغِیْثُ

فریاد رس۔ تکالیف کے وقت دستگیری کرنے والا اور مشکلات سے بچانے والا۔

۱۱۳ اَلْمُجِيْرُ

دنیاوآخرت کی تکالیف اور دونوں جہانوں کی ذلت ورسوائی سے پناہ دینے والا۔

۱۱۴ اَلْكَفِيْلُ

بندوں کی ظاہری اور باطنی ضروریات کی کفالت کرنے والا۔

۱۱۵ اَلدَّيَّانُ

اعمال کے مطابق جزاوسزا دینے والا، روزِ جزا کا مالک۔

۱۱۶ اَلنَّصِيْرُ

اپنے بندوں کی مدد کرنے والا اور ان کو دشواریوں سے بچانے والا۔

۱۱۷ اَلْمَوْلٰى

مالک، آقا۔ محبت کرنے والا اور امداد کرنے والا۔

۱۱۸ اَلسَّتَّارُ

بندوں کے رسواکن اعمال کی پردہ پوشی کرکے رسوائی سے بچانے والا۔ ستر اور پردہ پوشی کو پسند کرنے والا۔

۱۱۹ اَلْفَعَّالُ

ہر فعل اپنے ارادے سے کرنے والا۔ اس سے کوئی فعل بلا ارادہ --- جبراً، یا خطأً، یا نسیاناً صادر نہیں ہوتا۔

۱۲۰ اَلْعَلَّامُ

بہت زیادہ جاننے والا اور دیگر مخلوق کو قوتِ علمی عطا کرنے والا۔

۱۲۱ اَلْمُحِيْطُ

ہر چیز کا احاطہ کرنے والا۔ کوئی چیز اس کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں ہو سکتی۔

۱۲۲ اَلْمُسْتَعَانُ

جس سے مدد مانگی جائے اور بندوں کے مدد طلب کرنے کو پسند کرنے والا۔

۱۲۳ اَلْقَرِيْبُ

ہر شے سے نزدیک۔ اس کے اور مخلوق کے مابین کوئی حائل وفاصل نہیں ہے۔

۱۲۴ اَلْاَقْرَبُ

بندہ جس قدر اس کے قریب ہوتا ہے، اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ اس بندے کے قریب ہوتا ہے۔ شہ رگ سے زیادہ قریب۔

۱۲۵ اَلْاَكْبَرُ

اپنی کبریائی میں یکتا اور اس سے برتر کہ کوئی چیز اس کے ساتھ عبادت میں شریک کی جائے۔

۱۲۶ اَلْاَعْلٰى

سب سے عالی اور بلند۔ علو اور برتری میں کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

۱۲۷ اَلْحَيِيُّ

بہت حیا کرنے والا۔ فحش ومنکر کو ناپسند کرنے والا۔

۱۲۸ اَلسِّتِّيْرُ

حجاب انوار میں مستور رہنے والا۔ بندوں کے آپس میں ستر وعیب پوشی کو

پسند کرنے والا۔

۱۲۹ اَلرَّفِيقُ

نرمی کا معاملہ کرنے والا اور بندوں کے باہمی معاملات میں نرمی کو پسند کرنے والا۔

۱۳۰ اَلدَّافِعُ

آنے والی مشکلات اور مصائب کو دور کرنے والا۔

۱۳۱ اَلنَّاصِرُ

نصرت ویاوری کرنے والا۔امداد کرنے والا۔

۱۳۲ اَلْقَاضِی

فیصلہ کرنے والا اور حاجتوں کو پورا کرنے والا۔

۱۳۳ اَلْكَاشِفُ

مشکلات کو دور کرنے والا۔تکالیف سے نجات دینے والا۔

۱۳۴ اَلْاَرْحَمُ

سب سے زیادہ رحم کرنے والا۔ارحم الرّاحمین۔

۱۳۵ اَلْغَافِرُ

بندوں کے گناہوں پر پردہ ڈال کران کو رسوائی سے بچانے والا۔بخشنے والا۔

۱۳۶ اَلْخَلَّاقُ

بہت بڑا پیدا کرنے والا اور تخلیق میں تھکن اور سستی سے منزہ۔

۱۳۷ اَلۡفَرۡدُ

طاق، جس کا جفت اور ہمسر ناممکن ہے۔

۱۳۸ اَلۡمُنۡشِئُ

پیدا کرنے والا اور ایجاد کرنے والا۔

۱۳۹ اَلۡمُخۡرِجُ

نکالنے والا۔ عدم سے وجود، ظلمت سے نور اور خفا سے ظہور کی طرف۔

۱٤۰ اَلۡمُرۡسِلُ

بندوں کی رہنمائی کے لئے رسولوں کو بھیجنے والا اور تدبیر امور کے لئے ملائکہ کو بھیجنے والا اور بارش سے پہلے ہواؤں کو بھیجنے والا۔

۱٤۱ اَلسُّبُّوحُ

تمام عیبوں سے پاک اور بندوں کی تسبیح کو پسند کرنے والا۔

۱٤۱ اَلۡغِیَاثُ

مسائل ومشکلات میں بندوں کی فریادرسی کرنے والا اور ان کی امداد کرنے والا۔

***

یہ سب، اور ان کے علاوہ بھی بہت سے اسماء حسنٰی جو قرآن وحدیث میں مذکور ہیں، ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو پکارنا چاہئے اور دین و دنیا کی بھلائیاں اور اچھائیاں طلب کرنی چاہئیں۔

***

دوسرا باب

اَلْاِیْمَانُ بِالْمَلٰئِکَۃِ

یعنی

فرشتوں پر ایمان

چار سوالوں کے علمی و عقلی جواب۔ سوال نمبر ۳ کے جواب میں ملائکہ کے ثبوت کے لئے مصنف علّام رحمۃ اللہ علیہ نے چار ایسے قوی اور محکم دلائل پیش فرمائے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

فہرس

۱ سوال ۲۴

ملائکہ کس قسم کی مخلوق ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

۱ جواب ۲۴

وہ ایک نورانی اور روحانی مخلوق ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہر وقت منہمک اور چست و چالاک رہتی ہے۔

۲ سوال ۲۵

کیا اس مادی عالم کے علاوہ کوئی اور مخلوق بھی ہے جو مادی علائق (Material Intricacies) سے مبرا، غیر مرئی (Invisible) اور غیر محسوس (Unfelt) ہے؟ بغیر دیکھے کسی شے کے وجود کے تسلیم کرنے کو تو ہم پرستی (Superstition) کہا جاتا ہے۔

۲ جواب ۲۵

بے شک اس مادی عالم کے علاوہ روحانی مخلوق کا وجود قطعاً واجب التسلیم اور نا قابلِ انکار ہے۔ اس لئے کہ :-

{ا} انسان کے اندر دو جزو ہیں۔ ایک جسم مادی جو سفلی اور محکوم جزو ہے اور

دوسری روح جو اعلیٰ اور حاکم ہے۔ جس کو مدبّرِ بدن (Governor of the Body) اور نفسِ ناطقہ (Rational Soul) بھی کہا جاتا ہے۔ گو یہ جزو غیر مرئی اور غیر محسوس ہے مگر اس کا وجود محسوس اور مرئی ہونے پر موقوف نہیں ہے۔ اس لئے کہ جیسے ہر انسان اپنی عقل کا یقین رکھتا ہے، حالانکہ کبھی اس نے عقل کو نہیں دیکھا۔ نہ اس کے رنگ سے واقف ہے، نہ مقدار سے، نہ مقام سے اور نہ کسی اور حالت سے؛ بلکہ فقط اس کے آثار سے یقین کرتا ہے، ویسے ہی روح کو بھی سمجھ لیجئے۔

لہٰذا یقینی ہوا کہ ہر موجود کا محسوس اور مرئی ہونا ضروری نہیں؛ بلکہ آثار و علامات اور قرائن و قیاسات سے بھی اشیاء کا وجود تسلیم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اور انسان جب غور کرتا ہے تو اس مادی جزو کے علاوہ جو محکوم اور سفلی ہے، مادیات کے تین انواع جمادات، نباتات اور حیوانات کا مسلسل مشاہدہ کرتا ہے۔ اس سے اس امر کا یقین کرنا ضروری ہے کہ فطرت کے قانونِ تناسب و مساوات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے روحانیات میں بھی انسانی روح کے علاوہ کم از کم تین انواع مسلسل ہونی چاہئیں۔ اس لئے کہ عقل سلیم کے پاس اس کی کوئی وجہ نہیں کہ جزو ادنیٰ میں اس قدر ترقی ہو کہ تین انواع مسلسل پائی جائیں اور جزوِ اعلیٰ یعنی روح ایک ہی ہو اور وہ بھی مادی ظلمات میں مقید۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری نوع نہ پائی جائے۔ اس لئے اسلام مقدس میں مادیات کی طرح روحانیات کی بھی تین انواع کو ثابت کیا گیا ہے۔

۱-- پہلی نوع جو انسانی روح کی طرح عالم سفلی کی منتظم اور محافظ ہے اور جو اس عالم سفلی میں مادی تصرفات، مثلاً برسات وغیرہ کا انتظام اور دیگر امور جو انسانی قدرت سے مافوق ہیں، انجام دیتی ہے۔ اس نوع کو اسلامی اصطلاح میں ملائکۃ الارض کہا جاتا ہے یہ روحانی نوع، نوعِ انسانی کے بہت قریب ہے۔ عالمِ سفلی میں رہنے کے لحاظ سے بھی اور مادی انتظامات کے لحاظ سے بھی۔

۲---روحانیات کی دوسری نوع وہ ہے کہ جس کا مستقر (Abode) عالمِ علوی ہے، لیکن اس کا تعلق بعض وجوہ سے سفلیات کے ساتھ بھی ہے۔ اس لحاظ سے اس کا من وجہ (In a way) عالم علوی سے بھی تعلق ہے اور من وجہ عالم سفلی سے بھی۔

اس نوع کے بڑے ملائکہ چار ہیں، جن کے اسلامی نام یہ ہیں۔ جبرائیل، میکائیل، عزرائیل اور اسرافیل۔

جبرائیل کے ذمے عالمِ سفلی میں برگزیدہ بندوں کے ذریعہ علوم و معارفِ الٰہیہ تقسیم کرنا اور ان پاکیزہ بندوں کی مساعی جمیلہ میں امداد دینا اور ان کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو دور کرنا ہے۔

میکائیل کے متعلق بندوں کے تحفظ اور بقاء، یعنی رزق وغیرہ کی ضروریات بہم پہنچانا ہے۔

عزرائیل کے ذمہ جسم وروح کے تعلق کی میعاد ختم ہو جانے کے بعد روح کو جسم سے جدا کر کے عالمِ روحانی میں پہنچا دینا ہے۔

اسرافیل کے متعلق اس عالم کے اختتام اور دوسرے عالم کے آغاز کا اعلان کرنا ہے۔

۳---تیسری نوع ان روحانیات کی ہے جو عالمِ مادی سے بالکل بے تعلق ہیں۔ یہ نوع اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس میں ایسی منہمک رہتی ہے کہ اسے غیر اللہ کی خبر تک نہیں ہوتی۔ جیسے ملائکہ کروبین و حاملین عرش۔

اس اسلامی نظریہ کی رُو سے روحانیات اور مادیات کی انواع مساوی ہو جاتی ہیں اور جیسے مادیات میں ایک نوع انسان کے قریب ہے، جیسے حیوانات اور ایک متوسط، جیسے نباتات اور ایک بعید، جیسے جمادات، ویسے ہی روحانیات میں بھی ایک قریب ہے، جیسے ملائکۃ الارض، دوسری متوسط، جیسے چار ملائکہ اور تیسری بعید جیسے کروبین اور حاملین عرش۔

{۲} جب عالمِ مادیات پر غور کیا جاتا ہے تو اس کا نظام نہایت مسلسل اور مرتب نظر آتا ہے۔ سب سے ادنیٰ درجہ نوع جمادات کو دیکھا جائے تو اس میں ترقی ہوتے ہوتے اس کے بعض انواع، جیسے مرجان وغیرہ، صفت نمو (Quality to grow) کی وجہ سے نباتات سے ملے نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد نوعِ نباتات کو دیکھا جائے تو اس کے بعض اقسام میں ترقی ہوتے ہوتے بعض خصوصیات کے لحاظ سے نوعِ حیوانات سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں، جیسے کھجور اور کدّو وغیرہ --- کھجور کے درخت کی یہ حالت ہے کہ اس میں حیوانوں کی طرح نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ جب تک نر کا خوشہ مادہ کے خوشے سے نہ ملے پھل صحیح طور پر نہیں آتا۔ ایسے ہی اگر کدّو کو دیکھا جائے تو اس کی بیل جس سمت میں بڑھتی ہے اس طرف اگر کوئی رکاوٹ حائل ہو تو یہ قبل اس کے کہ اس تک پہنچے، اپنی سمت کو نہایت موزونیت اور لطافت سے بدل دیتی ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ یہ بیل ضعیف البنیان (Of Frail Foundation) ہے، کسی سہارے کے بغیر اوپر کو نہیں چڑھ سکتی۔ اس لئے قدرتِ کاملہ نے اس کو چھوٹی چھوٹی تاریں عنایت کی ہیں، جنہیں وہ درختوں کی شاخوں سے لپیٹ کر اوپر کو چڑھ جاتی ہے۔ اور قدرت نے اس کو کچھ ایسا شعور دیا ہے کہ جب کوئی ایسی چیز، شاخ وغیرہ، آجائے جس سے یہ اپنی تار لپیٹ سکے، وہاں تار کو نکالتی ہے اور جہاں اس قسم کی چیز نہ آئے جو لپٹنے کے قابل ہو، وہاں اپنے تار نہیں نکالتی۔

غرضیکہ تمام بیلدار درخت اپنی ان دو خصوصیتوں کے لحاظ سے اور ایسے ہی کھجور اپنی صفات کے لحاظ سے حیوانات سے مشابہ نظر آتے ہیں۔ اسی لئے بعض حکماء ان کے احساس و شعور کے قائل ہیں۔

اس کے بعد نوعِ حیوانات کو ملاحظہ کیجئے تو اس کی بعض اقسام اپنی بعض صفات کے لحاظ سے انسان سے ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جیسے شہد کی مکھی، ریچھ اور

بندر---شہد کی مکھی کی یہ خصوصیت ہے کہ انسانوں کی طرح ان میں ایک حکمران مقرر ہوتا ہے اور باقی سب مکھیاں اس کے حکم کے تابع ہوتی ہیں [1] ریچھ اور بندر کی یہ

---

[1] شہد کی مکھی کے بارے میں چند مزید انتہائی دلچسپ معلومات جناب یحییٰ ہارون کی کتاب (For Men of Understanding) سے پیشِ خدمت ہیں۔

شہد کے چھتے میں نہایت عمدہ ترتیب ونظم

شہد کی مکھیاں چھتے میں رہتی ہیں اوران کا شہد پیدا کرنا بڑا مسحور کن لگتا ہے، شہد کی مکھیوں کو بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں اور وہ سب کو بڑے احسن طریقے سے نظم وضبط میں لاتی ہیں۔

چھتوں میں نمی اور ہوا کی آمدورفت کے انتظام کو منظم کرنا

شہد کے چھتے میں نمی اور طراوت (Humidity) شہد کو ایک نہایت اعلیٰ حفاظتی خوبی مہیا کرتی ہے۔ مگر اسے ایک خاص حد کے اندر اندر رہنا چاہئے۔ اگر یہ نمی ان حدود سے کم رہ جائے یا ان سے تجاوز کر جائے تو پھر شہد خراب ہوجاتا ہے اوراس کی حفاظتی اور غذائی خاصیتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ سال کے دس مہینوں میں چھتے کا درجۂ حرارت ۳۵°C رہنا چاہئے۔ نمی اور درجۂ حرارت کو مخصوص حدود کے اندر رکھنے کے لئے شہد کی مکھیوں میں سے ایک خاص گروہ ''ہوا کی آمدورفت'' (Air Traffic) کا انتظام سنبھال لیتا ہے۔ ہوا کی آمدورفت کا نظام شہد کو دھوئیں اور ہوا کی آلودگی سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی مفید ہے۔

کسی بھی گرم دن شہد کی مکھیوں کو چھتے میں ہوا کی آمدورفت کے انتظام میں مصروف دیکھا جاسکتا ہے۔ چھتے کے اندر داخل ہونے والے دروازے پر شہد کی مکھیاں جمع ہوجاتی ہیں، وہ لکڑی کے ڈھانچے کے ساتھ چمٹ جاتی ہیں اور چھتے کو اپنے پروں سے ہوا دیتی ہیں۔ ایک معیاری چھتے میں ہوا کے داخل ہونے اور باہر نکلنے کے راستے جدا جدا رکھے جاتے ہیں۔

نظامِ صحت

شہد کی مکھیوں کی وہ کوششیں جو وہ شہد کے معیار کو محفوظ رکھنے کے لئے کرتی ہیں، صرف چھتے کے اندر نمی اور حرارت کو منظم کرنے تک ہی محدود نہیں ہیں؛ بلکہ چھتے کی حفاظت ونگہداشت کا بھی ایک نہایت جامع

حالت ہے کہ جو کچھ انہیں سکھایا جائے ویسے ہی سیکھ جاتے ہیں اور بعض تدابیر وحرکات سے انسان کو حیران کر دیتے ہیں۔ ایسے اور بھی بہت سے حیوانات ہیں جو اپنی بعض صفات کے لحاظ سے عالمِ انسانی سے ملتے جلتے ہیں۔

نظام موجود ہوتا ہے جو تمام حالات میں بیکٹیریا کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔ اس نظام نگہداشت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی بیرونی مادے کو چھتے میں داخل ہونے سے روکا جائے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر دو محافظوں کو ہر وقت چھتے کے داخلی دروازے پر چوکنا کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اگر احتیاط کے باوجود کوئی بیرونی مادہ یا کیڑا مکوڑا چھتے کے اندر داخل ہو جاتا ہے تو شہد کی تمام مکھیاں مل کر اسے باہر نکال پھینکتی ہیں؛ البتہ وہ بڑی بڑی چیزیں جن کو چھتے سے باہر نکالنا ممکن نہ ہو اس کے لئے ایک اور مدافعتی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔

شہد کی مکھیاں ان باہر کی چیزوں کو ''حنوط'' (Embalm) کر لیتی ہیں۔ وہ ایک ایسی رطوبت خارج کرتی ہیں جسے شہد کی مکھی کی رال (Resin) کہتے ہیں۔ پھر اس کی مدد سے وہ ''حنوط'' کا عمل تکمیل تک پہنچاتی ہیں۔ جو موم وہ صنوبر، سفیدے اور کیکر جیسے درختوں سے حاصل کرتی ہیں اس میں ایک خاص قسم کی رطوبت (Fluid) شامل کر کے، اس رال کو چھتے میں پڑ جانے والی دراڑوں کو پر کرنے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ہوا کے ساتھ اپنے ردعمل کے طور پر یہ موم جم جاتا ہے اور ایک سخت سطح تشکیل دے دیتا ہے۔ اب یہ تمام بیرونی خطرات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ شہد کی مکھیاں اس مادے کو اپنے بہت سے کاموں میں استعمال کرتی ہیں۔ یہی مادہ حنوط کرنے کے لئے بھی نہایت مؤثر اور مفید ثابت ہوتا ہے۔

کم از کم مواد سے زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اندوزی

شہد کی مکھیاں جو چھتہ تعمیر کرتی ہیں اس میں ۸۰۰۰۰ مکھیاں رہ سکتی ہیں۔ وہ مل جل کر کام کرتی ہیں اور اپنے لعاب (موم) سے چھتے میں چھوٹے چھوٹے حصے بنالیتی ہیں۔ ایک چھتے میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے خانے ہوتے ہیں۔ یہ تمام خانے ایک ہی سائز کے ہوتے ہیں۔ یہ تعمیراتی معجزہ ہزاروں مکھیوں کی مجموعی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ ان خانوں کو خوراک ذخیرہ کرنے اور چھوٹی شہد کی مکھیوں کی دیکھ بھال کے

غرضیکہ مادی موجودات کا سلسلہ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک نہایت مرتب اور سلسلہ وار چلا جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسان---جو محتاج بھی ہے اور مادی بھی---اور اللہ تعالیٰ کے مابین جو، ہر جہت سے مستغنی اور نورِ محض ہے کوئی مناسبت

لئے استعمال کرتی ہیں۔

کئی ملین برسوں سے لے کر اب تک شہد کی مکھیاں ان چھتوں کو چھ اضلاع کی مسدسی (Hexagonal) شکل میں تعمیر کر رہی ہیں۔ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ ان مکھیوں نے آٹھ ضلعی یا پانچ ضلعی کے بجائے چھ اضلاع والی مسدسی شکل کو کیوں چنا؟ اس کی دلیل ریاضی دان یہ دیتے ہیں کہ:-

''چھ ضلعی ڈھانچہ ایک ایسی موزوں ترین جیومیٹرائی شکل ہے، جس میں اکائی کا زیادہ سے زیادہ علاقہ استعمال ہو سکتا ہے''۔

اگر شہد کے چھتے کے خانوں کو کسی اور شکل میں بنایا جاتا تو بہت سے غیر استعمال شدہ علاقے باقی رہ جاتے۔ اس طرح کم شہد ذخیرہ ہو سکتا اور کم تعداد میں مکھیاں اس سے مستفید ہو سکتیں؛ جبکہ چھ ضلعی تعمیری شکل میں خانے ایک دوسرے میں فٹ ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی دیواریں مشترک ہو جاتی ہیں۔ اس سے کم از کم موم سے زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اندوزی یقینی بنائی جا سکتی ہے۔ ان خانوں کی دیواریں حالانکہ پتلی ہوتی ہیں مگر وہ اپنے وزن سے کئی گنا زیادہ بوجھ اٹھا سکتی ہیں۔

شہد کے چھتے کے خانوں کی دوسری خوبیاں

ایک اور بات جس کا خیال شہد کی مکھیاں چھتہ بناتے وقت رکھتی ہیں، یہ ہے کہ چھتے کے خانے ایک دوسرے کی طرف جھکے ہوئے ہوں۔ ان خانوں کو دونوں اطراف سے ۱۳ ڈگری بلند کر کے وہ ان خانوں کو زمین کے متوازی ہونے سے روک لیتی ہیں۔ اس سے شہد چھتے کے خانے کے منہ سے باہر نکل کر بہتا نہیں ہے۔ کام کے دوران کارکن مکھیاں (Workers) دائروں کی شکل میں ایک دوسرے کے ساتھ لٹک جاتی ہیں اور غول بنا کر جمع ہو جاتی ہیں۔ ایسا کرنے سے وہ موم بنانے کے لئے ضروری حرارت مہیا کرتی ہیں۔ ان کے پیٹوں

نہیں، لہٰذا انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ربط و تعلق تب ہی قائم ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی اور غیر مادی مخلوق موجود ہو، جسے لطافت اور غیر مادی ہونے کے لحاظ سے، اللہ تعالیٰ سے مناسبت ہو اور افتقار و احتیاج (Privation and Necessity) کے لحاظ سے اس کی مناسبت انسان کے ساتھ ہو۔ ورنہ موجودات کا نظام بے ربط ہو جائے گا اور چونکہ اس نظام کا

میں جو چھوٹی چھوٹی تھیلیاں ہوتی ہیں ان میں سے شفاف مائع (Liquid) نکلتا ہے، جو باہر بہہ بہہ کر موم کی پتلی تہوں کو سخت کر دیتا ہے۔ شہد کی مکھیوں کی ٹانگوں پر چھوٹے چھوٹے پھندے بنے ہوئے ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ موم جمع کرتی ہیں۔ وہ اس موم کو اپنے منہ میں ڈال لیتی ہیں، اسے چباتی اور نرم کرتی رہتی ہیں یہاں تک کہ اسے خانوں کی شکل میں ڈھال لیتی ہیں۔ کام کی جگہ کے لئے ایک خاص درجۂ حرارت کو یقینی بنانے کے لئے شہد کی مکھیاں مل جل کر کام کرتی ہیں تا کہ موم نرم اور لوچدار رہے۔

<u>وہ اپنی سمت کا تعین کیسے کرتی ہیں</u>

شہد کی مکھیوں کو عموماً دور دراز تک اڑ کر جانا ہوتا ہے تا کہ وسیع علاقوں کو چھان کر اپنی خوراک حاصل کر سکیں۔ وہ پھولوں کے زردانے اور شہد کے اجزائے ترکیبی کو چھتے کے اندر ۸۰۰ میٹر کے فاصلے کے درمیان جمع کرتی ہیں۔ شہد کی مکھی کو جہاں پھول نظر آ جاتے ہیں وہ ان کے بارے میں واپس آ کر دوسری مکھیوں کو بتاتی ہے مگر یہ مکھی ان پھولوں کے مقام اور جگہ کے محل وقوع کے بارے میں انہیں کس طرح سمجھاتی ہوگی؟

ناچ کر! ---- شہد کی مکھی چھتے میں واپس آ کر ناچنا شروع کر دیتی ہے۔ اس ناچ کے ذریعے وہ دوسری مکھیوں کو پھولوں کی جگہ کے بارے میں بتاتی ہے۔ وہ اس رقص کو کئی بار دہراتی ہے جس میں تمام معلومات شامل ہوتی ہے۔ سمت، فاصلے اور خوراک کی جگہ سے متعلق معلومات، سبھی کچھ جو ضروری ہوتا ہے اس رقص سے بتا دیا جاتا ہے۔ اس سے دوسری مکھیوں کو وہاں پہنچنے میں مدد مل جاتی ہے۔

یہ رقص دراصل "8" کا ہندسہ بناتا ہے جسے وہ شہد کی مکھی مسلسل دہراتی ہے۔ (اگلے صفحہ پر تصویر ملاحظہ کریں) مکھی اپنی دم ہلا ہلا کر اور پر پیچ رقص کر کے "8" کے ہندسے کا درمیانی حصہ بناتی ہے۔ ☜

چلانے والا اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے یہ کبھی بھی اس کے شایانِ شان نہیں ہوسکتا کہ اس کے نظم میں بے ربطی اور عدمِ تناسب ہو، لہٰذا روحانیات کا وجود عقلاً قابل تسلیم ہے۔

{۳} اگر چہ در پردہ ہر چیز کی علتِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن بظاہر اس نے اس عالمِ اسباب میں ہر تغیر و تبدیلی کے لئے اسباب مقرر کئے ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس کا کوئی سبب نہ ہو، گو بعض مواقع پر بعض اشیاء کے اسباب سے ہم مطلع نہ ہوسکیں۔

اس پر پیچ رقص کے درمیان جو زاویہ بنتا ہے اور وہ لکیر جو دھوپ اور چھتے کے درمیان ہوتی ہے وہ خوراک کے مقام کی سمت کی صحیح صحیح نشاندہی کر دیتی ہے۔

تاہم صرف خوراک کے منبع کا جان لینا ہی تو کافی نہیں ہوتا۔ کارکن مکھیوں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ انہیں شہد کے اجزائے ترکیبی حاصل کرنے کے لئے کتنا فاصلہ طے کرنا ہوگا۔ چنانچہ وہ شہد کی مکھی جب پھولوں کے بارے میں واپس آ کر دوسری مکھیوں کو بتانا چاہتی ہے تو پھولوں کے زردانوں کے فاصلے سے متعلق اپنی بعض جنبشوں کے ذریعے بتاتی ہے۔ ایسا کرنے کے لئے وہ اپنے جسم کے نچلے حصے کو حرکت دیتی ہے اور ہوا کی لہریں پیدا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر اس نے ۲۵۰ کا فاصلہ بتانا ہو تو وہ نصف منٹ میں اپنے جسم کے نچلے حصے کو پانچ بار حرکت دے گی۔ اس طرح وہ درست فاصلہ بتادے گی جو بڑا واضح ہوگا اور اس میں کچھ ابہام نہ ہوگا۔ اس میں فاصلہ اور سمت دونوں کی نشاندہی کر دی گئی ہوگی۔

شہد کی مکھی کے لئے وہاں ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے جہاں اسے خوراک کے مقام تک پورا چکر کاٹ کر زیادہ وقت میں پہنچنا ہوتا ہے۔ مکھی تو چونکہ خوراک کے مقام اور جگہ کے بارے میں دھوپ کی سمت کے ذریعے بتا سکتی ہے اور دھوپ ہر چار منٹ میں ایک ڈگری ہٹ جاتی ہے۔ اس طرح ہونا تو یہ چاہئے کہ شہد کی مکھی ہر چار منٹ کے لئے ایک ڈگری کی غلطی کرے، مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ شہد کی مکھی کو ایسا مسئلہ پیش ہی نہیں آتا۔ اس کی آنکھ کے اندر سینکڑوں چھوٹے چھوٹے چھ ضلعی عدسے (Lenses) لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر عدسہ بہت محدود علاقے کو دوربین کی طرح دیکھ لیتا ہے۔ دن کے ایک خاص وقت میں شہد کی مکھی

سورج
چھتہ
رقص
پھول
سورج
پھول
رقص
چھتہ
پہلا چکر
دوسرا چکر
160°
100°
60°

اس میں بھی شک نہیں کہ ان مادی موجودات کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت مجموعیہ (Collective form) اور دوسری حیثیت اجزائیہ (Individual Form) دوسری حیثیت کے لحاظ سے تو بعض اجزاء بعض کے لئے سبب ہو سکتے ہیں لیکن مجموعی اور کلی نظام کی رو سے ضرور ان کا سبب ایسا ہونا چاہئے جو ان سے خارج ہو، کیونکہ سبب مسبب سے خارج و مغائر ہوا کرتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ سبب اللہ تعالیٰ نہیں ہوسکتا

دھوپ کی طرف دیکھتی ہے اور اڑتے ہوئے اپنی منزل کا صحیح پتہ لگا لیتی ہے۔ یہ حساب کتاب مکھی اس روشنی کے استعمال کے ذریعے لگالیتی ہے جو سورج سے دن کے کسی خاص حصے میں خارج ہو کر آ رہی ہو۔ بالآخر مکھی اپنے ہدف کے مقام کی سمت کا تعین کر لیتی ہے اور اس میں کوئی غلطی نہیں کرتی۔ وہ اپنی معلومات میں تصحیح کر لیتی ہے جو اسے چھتے میں اس وقت دینی ہوتی ہیں جب سورج آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح وہ کارکن مکھیوں کی صحیح رہنمائی کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

<u>پھولوں پر نشان لگانے کا طریقہ</u>

جب کبھی کوئی شہد کی مکھی ایک پھول سے رس چوس کر لے آ چکی ہو تو بعد میں آنے والی مکھی کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ کوئی مکھی پہلے بھی اس پھول کا رس لے گئی ہے۔ ایسی صورت میں وہ اس پھول کو فوراً چھوڑ دیتی ہے۔ اس طرح اس کا وقت اور توانائی بچ جاتی ہے۔ مگر بعد میں آنے والی مکھی کو اس بات کا علم کیسے ہو جاتا ہے کہ وہ پھول کی پڑتال کئے بغیر سمجھ جاتی ہے کہ اس پھول کا رس پہلے ہی کوئی شہد کی مکھی چوس لے گئی ہے؟

یہ اس طرح ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ شہد کی مکھی جو پہلے اس پھول سے رس چوسنے آئی تھی وہ اس پھول پر ایک خاص قسم کے محلول (Solution) کا ایک قطرہ گرا کر آئی تھی تا کہ اس کی آمد کا بعد میں آنے والی مکھی کو علم ہو جائے۔ جب بعد میں کوئی شہد کی مکھی اس پھول کو دیکھتی ہے تو وہ اس خوشبو کو سونگھ کر اندازہ لگالیتی ہے کہ یہ پھول اب اس کے کسی کام کا نہیں رہا اور وہ سیدھی کسی اور پھول کی جانب بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح بعد میں آنے والی شہد کی مکھیاں اس پھول پر اپنا وقت ضائع نہیں کرتیں۔ ❀

کیونکہ سبب اور مسبب کے مابین تاثیر کے لئے مناسبت ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان، جو ہر حیثیت سے نورِ محض اور نا قابلِ تغیر ہے، اور اس عالمِ مادی کے درمیان، جو ظلماتِ مادیہ کا مجموعہ اور متغیر الذات والصفات ہے، کوئی مناسبت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس عالمِ مادی کے مجموعی نظام کا کوئی سبب غیر مادی اور روحانی ہونا چاہئے۔ جس کو لطیف اور غیر مادی ہونے کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ سے مناسبت ہو اور افتقارِ وجودی کے لحاظ سے اس عالم سے مناسبت ہو۔ ایسے ہی اسباب کو ملائکہ کہا جاتا ہے۔

{۴} تیسرے اور چوتھے باب میں انشاء اللہ پوری وضاحت کے ساتھ دلائل سے ثابت کیا جائے گا کہ انسانی عقول حفاظتِ حقوق میں احکام و قوانین الٰہیہ کی محتاج ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ انسان عالم مادی و سفلی میں ہوتے ہوئے اور ضروریاتِ مادیہ رکھتے ہوئے اس عالم سے مکمل طور پر تعلق منقطع کر کے عالمِ علوی کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے انسان کے لئے عالمِ علوی سے مناسب احکام حاصل کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا کوئی دوسری مخلوق ایسی ہونی چاہئے جو خود مادی اور سفلی ضروریات اور تعلقات سے بالکل مبرّا ہوتا کہ جب بھی اس عالمِ سفلی میں مناسب حکم نافذ کرنے کی ضرورت پڑے تو اس کے ذریعے وہ حکم عالمِ علوی سے عالمِ سفلی میں پہنچ جائے .... وہ مخلوق ملائکہ ہے۔

۳ سوال ۲۶

ملائکہ افضل ہیں یا انسان؟

۳ جواب ۲۶

انسانوں میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندے تین قسم کے ہیں:

۱---اعلیٰ، جن کو انبیاء اور رسل کہا جاتا ہے۔

۲---وہ نیک بندے جو انبیاء تو نہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کے بیان کردہ کمالات اور محاسنِ اخلاق کے جامع ہوتے ہیں، یعنی اولیاء اللہ اور علمائے راسخین۔

۳---وہ بندے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت تو کرتے ہیں لیکن ان کے مادے ایسے صاف نہیں ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کے اعلیٰ بندوں، یعنی رسولوں کے کمالات ان پر مکمل طور پر منعکس ہو جائیں۔

اسی طرح ملائکہ کی بھی تین قسمیں ہیں۔ایک رسل ملائکہ، دوسرے ان سے کم درجہ کے خواص ملائکہ اور تیسرے عوام ملائکہ۔پس انسانوں کی ہر ایک نوع، ملائکہ میں سے اپنی مقابل نوع سے افضل ہے۔

۴ سوال ۲۷

اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ انسان گو کتنی ہی طہارت وتصفیہ حاصل کرے، مادی ظلمات سے پاک نہیں ہوسکتا۔اور ملائکہ خود بذاتہٖ نورانی الذات (Created out of light) اور تمام مادی ظلمات سے پاک ہیں، پھر انسان ملائکہ سے افضل کیسے ہوئے؟

۴ جواب ۲۷

{الف} انسان فقط مادے کا نام نہیں ہے؛ بلکہ انسان کے اندر روح اور مادہ دو چیزیں ہیں۔روح اس کا جزو اعلیٰ ہے اور مادی بدنُ جزوِ اسفل---روح نہایت لطیف اور نورانی شے ہے اور مادی بدن اگرچہ کثیف اور ظلماتی ہے لیکن جب مادے پر روحانیت غالب ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے عشق کی آگ میں مادے کو پگھلا کر اس کے میل کو نکال دیا جائے اور اس کی کثافتوں (Impurities) کو جلا کر صاف کر دیا جائے تو وہ مادہ روحانی قوت کے لئے مددگار اور معاون ہو جاتا ہے۔اور اس کی وجہ سے روح کی طاقت بہت زیادہ قوی اور وسیع ہو جاتی ہے۔مثال کے طور پر قندیل کو ملاحظہ کیجئے، اس میں ایک شیشہ ہے اور دوسری بتی ہے۔ان دونوں کے مجموعے کا نام قندیل ہے۔گو بتی فی نفسہٖ روشن اور نورانی ہے اور شیشہ غیر نورانی لیکن جب یہ شیشہ صاف ہو تو اس بتی کی

روشنی اور وسعت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اگر شیشہ نہ ہو، فقط بتی ہی ہو تو اس کی روشنی ایسی تیز نہیں ہوتی، جیسے کہ شیشہ کے اندر رہ کر ہوتی ہے۔

اسی طرح پاک باطن انسان کی روح کی طاقت بہ نسبت ان روحانیات کے بہت زیادہ قوی اور وسیع ہے جو مادہ سے بالکل مجرد (Devoid) ہیں۔ اسی لئے جن علوم کو انسان حاصل کرسکتا ہے ان کی تحصیل سے ملائکہ قاصر ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام ① کا ابتدائے آفرینش (Creation) کا قصہ اس کا واضح ثبوت ہے۔

{ب} انسان کے جزوِ اعلیٰ یعنی روح کا تعلق اور مناسبت زیادہ تر عالمِ علوی (Heavenly World) سے ہے اور اس کے ادنیٰ جزو یعنی مادے کا تعلق اور مناسبت زیادہ تر عالم سفلی (Earthly World) سے ہے۔ اس وجہ سے روح اور مادے کے مابین تقاضوں کا ہمیشہ اختلاف رہتا ہے لیکن اس اختلاف کے باوجود اگر روحانی قوئ مادی قوئ پر غالب آ کر ان کو مطیع و مسخر کرلیں تو ظاہر ہے کہ یہ روح بہ نسبت اس روحانی

---

① ← 'آدم' علیہ السلام پہلے انسان تھے اور خدا کے اولین پیغمبر۔ ابوالبشر (انسانوں کے باپ) اور صفی اللہ (اللہ کے برگزیدہ) آپ کے القاب ہیں۔ آپ کے زمانے کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن مجید میں ہے کہ آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلیفۃ اللہ فی الارض قرار دیا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ انہیں سجدہ کرو۔ 'ابلیس' کے سوا تمام فرشتے سربسجود ہوگئے۔ 'ابلیس' نافرمانی کے سبب راندۂ درگاہ ٹھہرا (Banished from Heaven)۔ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں رہتے تھے۔ کچھ عرصے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی بائیں پسلی سے ایک عورت پیدا کی اور 'حوا' اس کا نام رکھا۔ ان دونوں کو حکم ہوا کہ جنت کی جو نعمت چاہو، استعمال کرو مگر اس درخت کے قریب نہ جانا۔ لیکن شیطان کے بہکانے پر انہوں نے بھول کر شجرِ ممنوعہ (Forbidden Tree) کا پھل کھالیا۔ اس پاداش میں دونوں کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیج دیا گیا۔

بعض روایات کے مطابق ہبوطِ آدم (Adam`s descent) کا مقام جزیرہ ☜

مخلوق کے جو مادی علائق سے مجرد ہے، بہت قوی اور افضل ہوگی کیونکہ اس کیلئے قوی موانع اور عوائق (Hindrances) موجود تھے اور ان تمام موانع کے مقابلہ میں فتح پا کر عالمِ قدس میں پہنچ گئی اور ملائکہ کے لئے یہ موانع نہیں ہیں، اس لئے ان کا عالمِ قدس میں ہونا بہ نسبت اس انسانی روح کے کوئی قدر نہیں رکھتا، اسی وجہ سے انسانی روح ملائکہ سے افضل ہے۔ ہاں، وہ انسان جس پر مادی ظلمات تہ در تہ جمے ہوں اور ان کی وجہ سے وہ یادِ الٰہی سے بالکل محجوب (Veiled) ہو، وہ کسی طرح ملائکہ سے افضل نہیں ہوسکتا۔

سراندیپ' (لنکا) تھا۔ یہاں یہ دونوں دوسو سال تک ایک دوسرے سے جدا رہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان کی لغزش کو معاف کر دیا اور 'جبرئیل' علیہ السلام انہیں مکے کے قریب عرفات میں چھوڑ آئے۔ آپ نے ۹۶۰ برس کی عمر پائی اور بقول یعقوبی 'جبلِ ابوقبیس' کے دامن میں واقع مغارۃ الکنوز (خزانوں کا غار) میں دفن ہوئے۔ بعض مؤرخین کے بقول طوفانِ نوح علیہ السلام کے موقع پر آپ کا جسد خاکی یروشلم میں لاکر دفن کیا گیا تھا۔

تیسرا باب

اَلْاِیْمَانُ بِالْکُتُبْ
یعنی
اللہ کی کتابوں پر ایمان

کتابیں نازل کرنے کی حکمت اور ضرورت، اللہ تعالیٰ کا بولنا اور کلام کرنا کیونکر ممکن ہے؛ جبکہ بولنے کے لئے زبان کا ہونا ضروری ہے جو انسانی جسم کا ایک حصہ ہے اور اللہ تعالیٰ جسمانیات سے پاک ہے! چھ (٦) انتہائی مشکل سوالات کے دل میں اتر جانے والے جوابات

فہرس

سوال ۱ - ۲۸

کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لئے کوئی کتاب بھی بھیجی ہے؟

جواب ۱ - ۲۸

ہاں، اس نے اپنے کلام کے ذریعے اپنے بندوں کو ہدایت کی ہے اور مناسب احکام بھیجے ہیں۔ اس لئے کہ؛

{الف} اللہ تعالیٰ نے انسان میں تین قوتیں رکھی ہیں۔ عقلیہ، شہوانیہ اور غضبیہ۔

[۱] عقلیہ کا تقاضا کسی چیز کا سمجھنا اور تدبیر کرنا ہے۔

[۲] شہوانیہ کا تقاضا کسی چیز کی خواہش اور شوق کرنا ہے۔

[۳] غضبیہ کا تقاضا خواہش کے خلاف کسی امر کے پیدا ہو جانے میں غضب کرنا اور حائل و مانع کو مغلوب کر کے اپنے شوق کو پورا کرنا ہے۔

یہ تینوں قوتیں ہر ایک انسان میں پائی جاتی ہیں، اور چونکہ انسانوں کی ضروریات بھی مشترک ہیں، ہر ایک کو مال کی ضرورت ہے، مکان کی ضرورت ہے، خورد و نوش اور لباس کی ضرورت ہے۔ مرد کو عورت کی اور عورت کو مرد کی ضرورت ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور انسان مدنی الطبع (Social) بھی ہے، الگ رہنا پسند نہیں کرتا، اور

ساتھ ہی مختلف طبائع بھی رکھتا ہے۔ اس لئے بوجہ اختلافِ طبائع مدنی الطبع اور مشترک المقاصد ہونے کے آپس میں اختلاف اور تصادم ضروری ہے۔ اس تصادم کو دور کرنے کے لئے ضرور کوئی ایسا انتظامی قانون ہونا چاہیے جو ہر ایک کے حقوق کی الگ الگ اور ہر ایک کے تصرفات کی علیحدہ علیحدہ حدیں مقرر کردے، تاکہ ہر انسان اپنی حدود کے اندر رہے اور ان سے تجاوز نہ کرنے پائے۔

ظاہر ہے کہ انسانی عقول مختلف ہیں، بعض عقلوں کا تقاضا ایک ہوتا ہے اور بعض کا دوسرا۔ اسی وجہ سے کسی زمانے کے عقلاء کا اتفاق رائے نہیں ہوسکا۔ سقراط کی ایک رائے ہے اور بقراط کی دوسری۔ افلاطون کی رائے اور ہے، ارسطو کی اور [1] اگر

---

[1] ← سقراط، بقراط، افلاطون اور ارسطو؛ چاروں مشہور فلسفی ہیں جن کا مختصر تعارف علی الترتیب درج ذیل ہے۔

سقراط۔ (SOCRATES) (۴۶۹-۳۹۹ق-م) یونان کا عظیم مصلح اور فلسفی۔ ایک سنگتراش کا بیٹا تھا۔ ابتدا میں باپ کا پیشہ اختیار کیا، لیکن بعد میں فوج میں ملازمت کرلی اور پوٹیڈیا اور پھر ڈیلیم کی جنگوں میں شریک ہوا۔ پھر ایتھنز واپس آکر غور وفکر شروع کیا۔ سچائی اور ایمانداری کا دلدادہ تھا اور لوگوں کو بحث اور مکالمے کے ذریعے سچائی کی ترغیب دیتا تھا۔ اس کا تبلیغ کا طریقہ دوسرے فلسفیوں سے مختلف تھا۔ وہ شاگردوں اور دوستوں وغیرہ سے باتوں باتوں میں علمی اصطلاحوں کی تعریف پوچھ بیٹھتا۔ مثلاً انصاف، نیکی یا محبت کیا ہے؟ اس طرح بحث کے دوران مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی اور نتائج اخذ کئے جاتے۔ سقراط کے مخالفوں نے اس پر الزام لگایا کہ وہ بے دین ہے اور دیوتاؤں کو نہیں مانتا، نیز اس کی تعلیم سے شہر کے نوجوانوں کے اخلاق خراب ہوتے ہیں۔ ایتھنز کے سینٹ میں اس پر مقدمہ چلا اور سقراط نے اپنی وکالت آپ کی۔ سینٹ نے اسے موت کی سزا دی۔ اس نے معافی مانگنے سے انکار کردیا اور زہر کا پیالا خوشی خوشی پی لیا۔ سقراط کا سب سے ممتاز شاگرد افلاطون تھا جس نے استاد کے حالات اور اقوال قلم بند کئے ہیں۔ ☜

انسانی عقل صحیح طور پر ہمیشہ رہنمائی کرسکتی تو عقلاء کا آپس میں اختلاف کیوں ہوتا؟ بلکہ بارہا ایک ہی انسان بعض مسائل کے متعلق یقین کرلیتا ہے اوران کو قطعاً صحیح سمجھتا ہے اور تھوڑی مدت کے بعد بعض انکشافات کی بناء پر اپنے سابقہ یقینیات کو سر بسر غلط سمجھتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسانی عقل صحیح رہنمائی کرنے سے عاجز ہے۔

سقراط نے علم کا ایک تصور پیش کیا۔ اس کے مطابق علم، جواس کے بقول صداقت (حق) کے ہم معنی ہے، اپنی ذات میں نیکی ہے۔ برائی اور جھوٹ (باطل) فقدانِ علم ہی کی پیداوار ہیں۔

بقراط۔ (HIPPOCRATES) (۴۶۹-۳۹۹ ق-م) مشہور یونانی حکیم جسے بابائے طب کہا جاتا ہے۔ جزیرہ کوس میں پیدا ہوا۔ طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد طبابت کرنے لگا۔ جادو، منتر اور تعویذ گنڈوں کے سخت خلاف تھا۔ اس زمانے میں جبکہ انسان کے ذہن پر توہمات سوار تھے، بقراط صرف حقائق پر یقین رکھتا تھا۔ اس نے یہ ثابت کر کے کہ ہر مرض کے قدرتی اسباب ہوتے ہیں، علاج معالجے کے فن کو پروہتوں کے ہاتھوں سے چھین لیا اور طب میں منطق واستدلال کو پہلی بار داخل کیا۔ اس نے بیماریوں کے اسباب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا، موسمی (آب و ہوا کی تبدیلی) اور ذاتی (غلط خوراک کا استعمال اور ورزش نہ کرنا) وہ دواؤں پر اتنا اعتقاد نہ رکھتا تھا جتنا غذا پر۔ بقراط اپنے شاگردوں سے حلف وفاداری لیتا تھا، جو ڈاکٹری کی سند پانے والے طلبہ کو اب بھی اُٹھانا پڑتا ہے۔

افلاطون۔ (PLATO) (۴۲۷-۳۴۷ ق-م) قدیم یونان کا عظیم فلسفی۔ اصل نام ارستوقلیس۔ ایتھنز کے ایک رئیس گھرانے میں پیدا ہوا۔ بیس سال کی عمر سے پہلے چند ڈرامائی اور حزنیہ نظمیں لکھیں۔ ۴۰۷ ق-م میں سقراط کا شاگرد ہوا اور آخر وقت تک اس کے ہمراہ رہا۔ سقراط کی وفات (۳۹۹-ق-م) کے بعد میگارا چلا گیا۔ جہاں اپنے دوست اقلیدس کے ساتھ ریاضاتی فلسفہ پڑھا، بعد ازاں مصر، افریقہ، اٹلی اور سسلی کا سفر کیا۔ افریقہ میں ریاضی دان تھیوڈورس (Theodorus) اور اٹلی میں فلسفی فیثاغورث (Pythagoras) سے ملاقات کی۔ سسلی کے حکمران وائنوشس نے خفا ہو کر ملک بدر ☜

اللہ تعالیٰ چونکہ رحیم و کریم ہے، اس نے انسان کو پیدا کیا ہے تو اس کو بغیر کسی انتظامی قانون کے ایسے اختلاف و نزاع کے موقع پر چھوڑ دینا کسی طرح اس کے رحم و کرم کے شایانِ شان نہیں ہوسکتا، کیونکہ ہر عاقل اپنے زیرِ دست اور زیرِ اثر لوگوں کے اختلاف کو ناپسند کرتا ہے۔ لہٰذا اس کی رحمت کے شایانِ شان یہی ہے کہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے احکام بذریعہ تقریر یا تحریر بھیجے۔ احکامِ الٰہی کے ان ہی مجموعوں کو کتاب یا صحیفہ کہا جاتا ہے۔

کر دیا۔ ایتھنز واپس آ کر ۳۸۷ ق-م میں اپنی مشہور عالم اکیڈمی (یونیورسٹی) قائم کی اور مرنے کے بعد اسی کے قریب دفن کیا گیا۔ اس اکیڈمی نے بڑے نامور آدمی پیدا کئے جن میں مشہور ارسطو تھا۔ سب سے پہلے افلاطون ہی نے اپنی تصنیف ''جمہوریت'' میں حکومت کا ایک مثالی خاکہ پیش کیا۔ وہ کہتا تھا کہ تصور حقیقت ہے اور کائنات کی ہر شئے اس حقیقت کا عکس ہے جس کا تصور ہمارے ذہن میں ہے۔ مادی دنیا حقیقت نہیں، حقیقت کا عکس ہے۔ اس لئے حواس کے ذریعے حقیقت کو نہیں پہچانا جاسکتا، حقیقت کا علم ایک چھٹی حس (Sixth sense) کے ذریعے ہوتا ہے جس کو وہ عقل یا ادراک کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس نے اپنی تصنیفات مکالمات کی شکل میں پیش کیں اور سقراط کی زبان سے اپنے خیالات بیان کئے۔

ارسطو۔(ARISTOTLE) (۳۸۷-۳۲۲ ق-م) فلسفی، ریاضی دان، ماہر فلکیات۔ یونان کی ایک ریاست مقدونیہ کے شہر ستاگیرا میں پیدا ہوا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں افلاطون کی شاگردی اختیار کی اور تقریباً بیس سال تک اس کی اکادمی کا رکن رہا۔ افلاطون کی وفات کے بعد ایتھنز میں اپنا ایک ادارہ قائم کیا جہاں اپنے دوستوں اور شاگردوں کو علمی، سیاسی اور سائنسی موضوعات پر درس دیتا تھا۔ کچھ عرصہ سکندرِ اعظم کا استاد بھی رہا۔ چالسیہ میں وفات پائی۔ ارسطو پہلا مفکر تھا جس نے علمِ طبیعات، فلسفہ، شاعری، حیاتیات، نفسیات، اخلاقیات اور دیگر علوم پر مستند کتابیں لکھیں۔ اس کی وفات کے بعد فلسفۂ یونان پر جمود طاری ہوگیا۔ ؏

{ب} اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اپنی مہربانی سے اس کے لئے مناسب ضروریات کو مہیا کیا ہے۔ لہٰذا عقلاً ضروری ہے کہ انسان خدا کا شکر گذار رہے اور جن کاموں سے اللہ تعالیٰ راضی وخوش ہو، ان کو کرے اور جو امور اس کی ناراضگی اور غضب کے موجب ہوں، ان سے اجتناب کرے۔ ظاہر ہے کہ انسان از خود اللہ تعالیٰ کی رضا اور عدم رضا کو صحیح طور پر معلوم کرنے سے قاصر ہے۔ اس لئے کہ انسان دوسرے انسان کا ہم جنس ہونے کے باوجود اس کے اسباب رضا وعدمِ رضا کو معلوم کرنے سے بہت دفعہ قاصر رہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ، جو ہر طرح بشری صفات سے منزہ اور عقلی ادراک سے مافوق ہے، اس کی رضا اور عدمِ رضا کے اسباب کو انسان کیسے معلوم کرسکتا ہے!

جب انسان اللہ تعالیٰ کے موجباتِ رضا وعدم رضا کو معلوم کرنے سے قاصر ہوا، تو اس کی نعمتوں کے شکر سے، جو انسان کا امتیازی شرف ہے، اس کی راہنمائی اور ہدایت کے بغیر ضرور محروم رہ جاتا، اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی عام وسیع رحمت اور اس کی بے حد وحساب عنایت کے تقاضوں کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی، اس لئے ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنے اسباب رضا وخوشنودی اور اسبابِ غضب وناراضی سے مطلع فرمائے۔ اسی مقصد کے لئے کتابیں نازل کی گئی ہیں۔

۲ سوال ۲۹

کلام کا ذریعہ تو زبان ہے جو مادی چیز ہے اور پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہٗ مادی صفات سے پاک ہے۔

نیز کلام حروف سے مرکب ہوتا ہے اور حروف کا تلفظ تقدیم وتاخیر چاہتا ہے جو خواص زمانہ سے ہے، اور ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمانہ سے پاک ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کلام سے کیسے متصف ہوسکتا ہے؟

۲ جواب ۲۹

جواب: کلام کے لئے یہ ضروری نہیں کہ صرف مادی ذریعہ سے ہو اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ اس کے حروف کے تلفظ میں تقدیم و تاخیر زمانی ہو۔ ہم چونکہ مادی (Corporeal) ہیں اور زمانی (Tempral) بھی، اس لئے ہمارا کلام مادی ذریعہ (Manterial Medium) زبان (Tongue) کا محتاج ہے اور زمانہ کے بغیر ناممکن ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ چونکہ غیر مادی اور غیر زمانی ہے، لہٰذا اس کا کلام دونوں کا پابند نہیں ہے اور نہ اس کا قیاس ہمارے حال پر صحیح ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر ایسا سمجھ لیجئے کہ روح سے جو افعال مادہ کے ذریعے صادر ہوتے ہیں ان میں کتنی دیر لگتی ہے اور کتنے آلات و اسباب کی ضرورت پڑتی ہے؟ اور جو افعال براہِ راست جسمانی اعضاء کے بغیر سرزد ہوتے ہیں وہ کتنے جلدی ہو جاتے ہیں۔

مثلاً عالم خواب میں جب تمام مادی آلات معطل ہو جاتے ہیں تو روح تھوڑے سے زمانے میں کتنے دور دراز مقامات کی سیر کر لیتی ہے اور کتنے کلام کر لیتی ہے۔ اس حالت میں نہ کوئی مادی ذریعہ ہوتا ہے اور نہ زیادہ زمانہ صرف ہوتا ہے، باوجودیکہ روح اس مادی قالب میں مقید ہے۔ جب اس کی یہ حالت ہے تو پھر اللہ تعالیٰ جو تمام مادی کیفیات سے مافوق ہے، اس کے کلام میں تقدیم و تاخیر اور مادی ذرائع کی کیا ضرورت ہے؟

۳ سوال ۳۰

اللہ تعالیٰ کا کلام ہم تک کیسے پہنچتا ہے، بذریعہ تحریر یا بذریعہ تقریر؟

۳ جواب ۳۰

اللہ تعالیٰ کا کلام بذریعہ تحریر بھی پہنچتا ہے، جیسے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی گئی اور بذریعہ تقریر بھی، جیسے ان سے کوہِ طور پر کلام کیا جاتا تھا۔ اور کبھی بذریعہ قاصد ہوا

کرتا ہے، جیسے کلامِ مجید کا نزول بذریعہ جبرائیل ہوا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اپنے برگزیدہ بندے کو عالمِ روحانی میں؛ بلکہ اس سے بھی بالا بلا کر اس سے کلام کیا ہے، جیسے ہمارے نبی محمد ﷺ ① سے شبِ معراج میں۔

۳۱ سوال ۴

اللہ تعالیٰ کے فرمان کی کتنی کتابیں ہیں اور ان میں سے افضل کون سی ہے؟

---

① ← پیغمبر اعظم و آخر۔ ولادت ۲۰/اپریل ۵۷۱ء مطابق ۹/ربیع الاول (پیر کے دن) شعب بنی ہاشم میں بمقام مکہ معظمہ ہوئی۔ والد عبداللہ ولادت سے چند ماہ قبل وفات پا چکے تھے۔ ماں کا نام آمنہ بنتِ وہب تھا۔ دادا عبدالمطلب نے محمد نام تجویز کیا۔ اشراف قریش کے رواج کے مطابق پیدائش کے بعد ایک دایہ حلیمہ سعدیہ کے سپرد کئے گئے۔ حلیمہ قبیلہ ہوازن کی شاخ بنوسعد سے تعلق رکھتی تھیں۔ تقریباً چار برس حلیمہؓ کے گھر گزارنے کے بعد والدہ کے پاس مکہ واپس تشریف لائے۔ چھ برس کی عمر میں والدہ کا انتقال ہو گیا تو پرورش و کفالت کی ذمہ داری دادا عبدالمطلب نے لے لی۔ آٹھ برس کی عمر ہوئی تو عبدالمطلب کا انتقال ہو گیا اور مرنے سے پہلے وہ پوتے کو اپنے بیٹے ابوطالب کی کفالت میں دے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوطالب کے ساتھ ۱۲ برس کی عمر میں بصرہ اور شام کا سفر فرمایا۔ دوسرا سفر عالم شباب میں مکہ کی ایک متمول خاتون خدیجہؓ بنتِ خویلد کی درخواست پر ان کے مال سے تجارت کے لئے کیا۔ واپسی پر خدیجہؓ نے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ رسول اللہ ﷺ رضامند ہو گئے اور شادی ہو گئی۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر ۲۵ برس اور خدیجہؓ کی ۴۰ سال تھی۔ وہ بیوہ تھیں۔ ۴۰ برس کی عمر میں مکہ کے ایک غار حراء میں آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ اس وحی کا سلسلہ ۲۳ برس تک رہا۔ قرآن کریم انہی آسمانی ہدایات کا مجموعہ ہے۔ نزولِ وحی کے بعد آپ نے اسلام کا اعلان کیا تو عام لوگوں نے آپ کی بات کو قابلِ غور نہیں سمجھا۔ مگر آپ متواتر یہ پیغام سناتے رہے تو چند لوگ متاثر ہو کر آپ کے حلقے میں آ گئے؛ البتہ اکثریت شدید مخالف ہو گئی۔ اسی مخالفت کے باعث ایک روز اہل مکہ نے آپ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا، مگر جو رات اس منصوبے کے لئے مقرر تھی اسی رات آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ مدینہ ہجرت کر گئے۔ ☜

جواب ۴۱

مشہور کتبِ الٰہیہ چار ہیں۔ تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید۔ ① یہ کتابیں فرمانِ الٰہی کی حیثیت سے سب مرتبے میں مساوی ہیں؛ البتہ دیگر وجوہ کی بناء

ہجرت کے بعد ۱۰ برس کی تاریخ اہم واقعات سے لبریز ہے۔ مدینہ میں آپ نے باقاعدہ ایک منظم حکومت کی بنیاد رکھی اور اپنی زندگی میں صرف مکہ فتح کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا؛ بلکہ پورے جزیرہ عرب کو اپنا مطیع فرمان بنا کر ایک مضبوط طاقت میں بدل دیا۔ آپ کے وصال تک عربی زبان بولنے والے ایک مذہب اور ایک جھنڈے تلے جمع ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے بعد میں پھیل کر اس وقت کی دو طاقتور حکومتوں ایران اور روم کے پرخچے اُڑا دیئے اور ان کے علَم اندلس سے اقصائے چین تک لہرانے لگے۔ آپ کا وصال ۸ جون ۶۳۲ء مطابق ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ بروز پیر مدینہ منورہ میں ہوا۔ روضۂ اطہر اسی شہر میں ہے۔ آپ بے حد رقیق القلب مجسم رحم وعفو تھے۔ بڑے سے بڑے دشمن کو بھی معاف فرما دیا کرتے تھے۔ آپ بھوکے رہ کر بھوکوں کو کھلانے والے، آپ پھٹا پرانا پہن کر دوسروں کو پہنانے والے، غریبوں کے ملجا، یتیموں کے ماوا، فقیری پر فخر کرنے والے، توکل، قناعت، استغنا، شکر، صبر، تفویض، رضا، ایثار اور عبدیت کا سبق اپنے عمل سے دینے والے تھے۔

لَا یُمْكِنُ الثَّنَاءُ كَمَا كَانَ حَقُّهٗ   بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

☆☆☆

① ← چاروں مقدس کتابوں کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے۔

۱- توریت

وہ آسمانی کتاب جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور جس کا قرآن پاک میں جگہ جگہ ذکر آتا ہے۔ نص قرآنی یہ ہے کہ یہودیوں نے اس میں حسب ضرورت ترمیم کر لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گو اس میں تقریباً وہی قصص اور احکام پائے جاتے ہیں جو قرآن شریف میں ہیں لیکن عقائد اور مسائل میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے اور وہ تمام باتیں جو اسلام کو سچا مذہب ثابت کرتی ہیں، اس میں سے نکال ☜

پر بعض کتابیں بعض سے افضل ہیں۔ جیسے قرآن مجید، کہ اس کا فائدہ عام ہے، عام مخلوقات کی ہدایت کے لئے اسے بھیجا گیا ہے اور دائمی معجزہ ہے۔ اس لئے اس کو باقی کتابوں پر فضیلت حاصل ہے۔

۵ سوال ۳۲

اس وقت کون سی کتاب قابلِ عمل ہے؟

دی گئی ہیں۔ اسی لئے جب حضورؐ سے توراۃ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ان کتابوں کو نہ سچ کہو نہ غلط۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہم اللہ اور اس کی کتابوں پر ایمان لائے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں یہودی توریت کے مضامین کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں ان کو اس پر مطعون کیا گیا ہے کہ وہ بعض باتیں ظاہر کرتے ہیں اور بعض کو چھپالیتے ہیں۔ مؤخر الذکر باتوں میں حضور ﷺ کے سچے پیغمبر ہونے کی بھی شہادت ہے۔ یہود سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر سچے ہو تو تورات لاؤ اور سب کے سامنے سناؤ۔

ب۔ انجیل

یونانی لفظ بمعنی خوشخبری۔ کتب سماوی (Revealed Books) (توریت، زبور، انجیل، قرآن) میں سے ایک صحیفہ، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا۔ اس کتاب مقدس کے اصلی اور ابتدائی نسخے ناپید ہیں۔ اگر ہوتے بھی تو بعد نزولِ قرآن پاک ان کو منسوخ تصور کیا جاتا۔ اہل اسلام اسے بھی الہامی کتاب مانتے ہیں اور اس کا ذکر قرآن شریف میں جگہ جگہ آیا ہے۔ انجیلیں موجودہ چار ہیں۔ انجیل متی، انجیل مرقس، انجیل لوقا اور انجیل یوحنا۔ ان میں سے پہلی تین کو اناجیل خلاصہ (Synoptic Gospels) کہتے ہیں، کیونکہ ان میں واقعات کے ایک ہی سلسلے کے خلاصہ جات دیئے گئے ہیں۔ برخلاف یوحنا کی انجیل کے کہ اس میں دوسری قسم کے واقعات کا بیان ہے۔ یہ چاروں اناجیلِ مصدقہ (Canonical Gospels) کہلاتی ہیں۔۔۔عیسائیوں کی چرچ ہسٹری کی رو سے اور کئی انجیلیں بھی ہیں لیکن کلیسا ان کو مقدس نہیں مانتا۔ ان میں سے ایک انجیل برناباس کی بھی ہے جس میں نبی آخرالزمان ﷺ کا نام فارقلیط دیا گیا ہے اور جس کا ترجمہ محمد ﷺ ہے۔ ان چار انجیلوں میں بھی وقتاً فوقتاً تحریف ہوتی رہی ہے کیونکہ کئی جگہ سے آیتیں اُڑا دی گئی ہیں اور کئی فقرات کو بدل کر ان کے معنی ☜

جواب ۵ ۳۲

قرآن مجید۔ اس لئے کہ یہ آخری کتاب ہے اور سب کی ناسخ (Counterbalance) ہے کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ حاکم کا پچھلا حکم اگلے حکم کا ناسخ ہوا کرتا ہے۔

تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔ اس قسم کی تحریفات کی وجہ جواز یہ بیان کی جاتی ہیں کہ نئے اور زیادہ مصدقہ نسخے دستیاب ہونے کے باعث موجودہ نسخوں کی تطبیق اور تصحیح لازمی تھی۔

ج- زبور

قرآن پاک میں جن چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے ان میں زبور بھی شامل ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام جب اس کو پڑھا کرتے تھے تو علاوہ جن وانس کے، وحوش و طیور بھی اس کو سننے کے واسطے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ اصل کتاب اب دنیا سے ناپید ہو چکی ہے اور اس کے متعلق بہت کم علم ہے۔ اس کا کچھ حصہ موجودہ توریت میں شامل ہے اور اسے حضرت داؤد علیہ السلام کے گیت (Psalms) کہا جاتا ہے، لیکن اس امر میں بہت شبہ ہے کہ وہ اصل ہیں بھی یا نہیں۔ لفظ زبور شامی، عبرانی اور قبطی زبانوں میں بھی مروج ہے اور اس کے معنی تحریر یا کتاب کے ہیں۔

د- قرآن مجید

مسلمانوں کی مقدس کتاب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ قرآن کے اجزا کو سورت اور سورت کے اجزاء کو آیت کہتے ہیں۔ قرآن حکیم حسب موقع ۲۳ سال تک جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے چالیسویں سال میں سورہ اقراء کی آیتیں غارِ حرا (مکہ مکرمہ) میں نازل ہوئیں اور آخری آیت (اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ) [المائدہ، آیۃ۳] ۱۱ھ کو حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قرآن مجید لکھا تو جا چکا تھا اور اکثر صحابیوں نے حفظ بھی کر لیا تھا مگر ابھی تک یہ کتابی صورت میں مدون نہ ہوا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے اس کو ایک جلد میں جمع کرایا۔ ان کی وفات کے بعد یہ نسخہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس ☜

سوال ۶ ۳۳

اللہ کے کلام میں نسخ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ موجوہ اور آئندہ حالات سے خبر دار ہے۔ جب اس کو معلوم تھا کہ یہ حکم آئندہ غیر مفید ہوگا تو پہلے ہی سے ایسا حکم کیوں نہ دیا جس میں آئندہ تغیر وتبدل کی ضرورت نہ پڑتی؟

جواب ۶ ۳۳

بے شک اللہ تعالیٰ موجودہ اور آئندہ حالات سے باخبر ہے، لیکن اس کے احکام میں مصالح عباد (بندوں کی مصلحت) کالحاظ ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ بندوں کی حالت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی۔ لہٰذا ان کے حالات کالحاظ فرماتے ہوئے اگر احکام میں کچھ تغیر وتبدل کرے تو اس سے اس کے علم وخبر پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

آیا اور پھر حضرت عثمان ﷺ نے حضرت حفصہؓ سے یہ نسخہ لے کر اپنے دور خلافت میں اس کی سات نقلیں کرا کے مختلف ممالک میں بھیج دیں۔

قرآن کی سات منزلیں ہیں۔ یہ منزلیں ہفتہ کے سات دنوں کے حساب سے رسول اللہ ﷺ نے قائم کی تھیں۔ قرآن میں کل ایک سو چودہ سورتیں ہیں جنہیں رکوعوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مکے میں ۸٦ سورتیں اور مدینہ میں ۲۸ سورتیں نازل ہوئیں۔ ۴۳۰ھ میں حجاج بن یوسف ثقفی نے قرآن پر اعراب لگائے۔ ۸٦ھ میں نقطے لگائے گئے۔ خلیل بن احمد بصری نے تشدید، ہمزہ اور مد لگائے۔

قرآن اسلامی عقیدہ وقانون کا بنیادی ماخذ ہے۔ اس کے مضامین تقریباً تمام شعبہ ہائے زندگی کو احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ قرآن کو کلام اللہ تسلیم کرنا اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ہے۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق قرآن ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے کیونکہ اس کی حفاظت کا وعدہ خود خدا نے کیا ہے۔

***

چوتھا باب

اَلْاِیْمَانُ بِالرُّسُل

یعنی

رسولوں پر ایمان

نبی اور رسول کس قسم کی ہستیاں ہوتی ہیں؟ نبوت اور رسالت میں کیا فرق ہے؟ رسول بھیجنے کی ضرورت کیا ہے؟ حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا عقلی ثبوت کیا ہے---اس طرح کے بارہ سوالات کے اطمینان بخش اور دلپذیر جوابات

فہرست

سوال ۱ — ۳۴

رسالت کے کیا معنی ہیں اور رسول کسے کہتے ہیں؟

جواب ۱ — ۳۴

رسالت ورسول دونوں عربی لفظ ہیں۔ پہلا مصدر ہے اس کے معنی بھیجنے کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں رسالت اسے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو منتخب کرکے دوسرے انسانوں کی اصلاح کے لئے مناسب حال احکام اور معجزات دے کر بھیجے۔ اور ''رسول'' اس برگزیدہ انسان کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ عام انسانوں کی اصلاح کے لئے مقرر فرمائے۔

سوال ۲ — ۳۵

کیا انسان کی عقل اس کی اصلاح کے لئے کافی نہیں ہوسکتی؟

جواب ۲ — ۳۵

نہیں۔ اس لئے کہ انسانی عقول کے لئے کوئی ایک ضابطہ نہیں ہے۔ ان میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے، یہی سبب ہے کہ کسی زمانہ میں بھی کسی عقلی مسئلہ پر عقلاء متفق

نہیں ہو سکے۔ فیثا غورث ① کی ایک رائے ہے تو سقراط اور افلاطون کی دوسری۔ بقراط کی رائے الگ ہے اور ارسطو ② کی الگ۔ حالانکہ یقینی امر ہے کہ مختلف آراء میں حق صرف ایک رائے ہوتی ہے۔ دو متضاد چیزیں حق نہیں ہو سکتیں۔ اگر عقل معرفتِ حق کے لئے کافی ہوتی تو سب عقلاء معیار عقل سے حق معلوم کر کے متفق الرائے ہو جاتے اور وادیٔ اختلاف وانشقاق میں حیران وپریشان نہ پھرتے۔

یقیناً انسانی عقل اس کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں ہو سکتی اور نہ کسی اختلافی مسئلے میں انسانی عقل تعینِ حق کر سکتی ہے۔ اگر دو عقلاء کا کسی امر میں اختلاف ہو جائے تو ہر ایک ایسے عقلی دلائل پیش کرے گا جن کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہو۔ بعینہ یہی حال دوسرے کا بھی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان کا تصفیہ ضرور کسی ثالث سے ہو گا۔ یہ ثالث بھی اگر اپنی عقلی وجوہات سے کسی ایک کو حق بجانب تسلیم کرے گا تو اس کی عقلی وجوہات سے دوسرے مخالف کو اکثر وبیشتر اطمینان اور قلبی تسکین حاصل نہ ہوگی۔

---

① ← فیثا غورث (Pythagoras) (۵۸۲-۵۰۰ ق م) مشہور یونانی فلسفی، ریاضی دان اور ماہر فلکیات ہے۔ سیماس (Samos) (ترکی) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ بہت سے ملکوں کی سیاحت کرنے کے بعد کروٹون (Croton) میں سکونت اختیار کی۔ فلسفی کی حیثیت سے اس کی شہرت ۵۴۰ اور ۵۰۰ ق م کے درمیان عروج پر پہنچی۔ اس نے جیومیٹری کے متعلق بعض قواعد بنائے جن میں سے اس کا ایک دریافت کردہ مسئلہ آج تک اس کے نام سے مشہور ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ ایک قائم الزاویہ تکون کے قائم الزاویہ کے بالمقابل ضلع کا مربع دوسرے دونوں ضلعوں کے مربعوں کے مجموعے کے برابر ہوتا ہے۔

② ← سقراط، بقراط، افلاطون اور ارسطو کا تذکرہ علی الترتیب باب نمبر۳، صفحہ نمبر۸۱، پر گزر چکا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ وہ کسی مصلحت سے کبھی سکوت اختیار کر لے۔ اس لئے کہ ثالث کی عقلی وجوہات کے مقابلہ میں ہوسکتا ہے کہ اس کے پاس بھی ایسی عقلی وجوہ ہوں جو اس کے لئے مفید یقین ہوں۔ لہٰذا اطمینانی فیصلہ کے لئے انسانی عقول کافی نہیں ہوسکتی۔

سوال ٣٦

بنی نوع انسان سب اللہ کی مخلوق ہیں لیکن ہر ایک کو اللہ تعالیٰ خود بخود اس کے اصلاحی امور سے آگاہ نہیں کرتا؛ بلکہ سب کے لئے ایک مصلح (Reformer) مقرر کرتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب ٣٦

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک روح اور دوسری جسم۔ روح نہایت لطیف اور نورانی جزو ہے اور جسم کثیف اور ظلمانی جزو ہے۔ چونکہ انسان کا ایک جزو کثیف اور ظلمانی ہے اور ماحول، یعنی یہ عالم بھی سب ظلمانی ہے اس لئے ماحول کے غلبے کی وجہ سے روح کی نورانیت عام طور پر مضمحل پڑ جاتی ہے اور ایسے جوان مرد بہت تھوڑے ہوتے ہیں جو اس عالمِ ظلمانی میں رہتے ہوئے ظلمانی اثرات سے متاثر نہ ہوں---البتہ ان میں سے چند ایسے ضرور ہوتے ہیں جو مادی تعلقات میں کمی کرتے کرتے بالآخر مادی اثرات سے بالاتر ہو جاتے ہیں اور ان کی روحانی قوت اس قدر ترقی کر جاتی ہے کہ ان کی نورانیت سے مادی قوئ بھی منور ہو کر سراپا نور ہی نور بن جاتے ہیں---اگرچہ ایسے انسان بہت ہی کم ہیں۔

چونکہ قابل (Object) اور فاعل (Subject) کے مابین توافق و تناسب (Concord and correlation) کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ عام انسانوں کے درمیان جو ظلماتِ مادیہ میں گھرے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مابین جو نورِ حقیقی اور تمام

ظلمات وعیوب سے پاک ہے، کسی طرح کی نسبت نہیں، اس لئے عوام اللہ تعالیٰ سے ان علوم ومعارف کے حاصل کرنے سے عاجز ہیں جن سے ان کی اصلاح ہوتی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت عامہ سے انسانوں کو ظلمات سے نکالنے کے لئے انسانوں ہی میں سے ایسے پاک بندے منتخب فرمائے جن کو ظاہری صورت کے لحاظ سے انسانوں سے مناسبت تھی اور باطنی طہارت ونورانیت کی وجہ سے ان کو اللہ تعالیٰ سے مناسبت تھی۔ یہ بندے اپنی باطنی مناسبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے علوم ومعارف حاصل کرنے کی صلاحیت لئے ہوئے تھے لیکن ظاہری بشری صورت کی مناسبت سے عام انسانوں کو ان پاکیزہ علوم ومعارف سے مطلع کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔

منشا یہ تھا کہ لوگ اپنی ظلمانی خواہشات اور مادی تعلقات کو چھوڑ کر ان علوم کی برکت سے اپنے اندر نورانیت پیدا کریں اور آنے والے نورانی عالم (Spiritual world) میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں۔

۴ سوال ۳۷

اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی اصلاح کی ضرورت ہی کیا تھی؟ جو کام اپنے لئے مناسب سمجھتے، کرتے اور جو مناسب نہ سمجھتے، نہ کرتے۔ انسان اچھا ہوتا تو اپنے لئے اور برا ہوتا تو بھی اپنے لئے۔ اللہ تعالیٰ کو نہ ان کے اچھا ہونے سے کوئی فائدہ ہے اور نہ بُرا ہونے سے کوئی نقصان۔

۴ جواب ۳۷

{الف} بیشک اللہ تعالیٰ کو انسانوں؛ بلکہ تمام مخلوقات کے اچھا اور بُرا ہونے سے کوئی نفع ونقصان نہیں، تاہم اس کی رحمتِ کاملہ اور ربوبیت شاملہ کا تقاضا ہے کہ

انسان کو، جسے اس نے اشرف المخلوقات (The Noblest of Creatures) کا لقب عنایت فرمایا ہے، نورِ علم ومعرفت سے منور کر کے اس کی ظلمتِ جہالت (Darkness of Ignorance) کو دور کرے۔ خصوصاً جب اس کی ظاہری صورت کو سب سے بہتر بنایا ہے تو لازم تھا کہ اس کی باطنی کیفیت بھی باکمال اور نورانی ہوتی۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ماں اپنے بچے کا صبح سویرے اٹھ کر منہ دھلاتی ہے، اس کو سنوارتی ہے۔ اس کی ظاہری آراستگی وپیراستگی کے لئے انائیں متعین کی جاتی ہیں، تہذیب وتمدّن سکھلانے کے لئے اتالیق (Tutors) مقرر کئے جاتے ہیں، علوم وفنون پڑھانے کے لئے علماء وفضلاء منتخب کئے جاتے ہیں۔

ماں باپ کی اتنی توجہ اس پر کیوں ہوتی ہے؟ کیا چیز ان کو مجبور کرتی ہے؟--- صرف ایک قلبی تعلق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ودیعت (Entrust) کیا ہے۔ یہی تعلق ان کو اولاد کی ظاہری وباطنی حسنِ تربیت پر آمادہ کرتا ہے۔

ان کے دلوں میں اس تعلق کو کس نے پیدا کیا؟ اس تعلق کا اصلی مالک اور قاسم کون ہے، جس نے نہایت مناسب وموزوں طریقہ سے اسے دلوں پر تقسیم کیا ہے؟ لازماً یہ وہی ذات ہے جو دلوں کی مالک ہے اور جس نے کائنات کو ظلمتِ عدم سے نورِ وجود عطا کیا۔ کیا اس ماں باپ کے تعلق سے جو انہیں اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا تعلق اور لگاؤ اپنی مخلوق سے بہت زیادہ نہیں؟--- کیوں نہیں، ضرور اس کا تعلق اپنی مخلوق سے بہت قوی اور زائد ہے، بہ نسبت اس تعلق کے جو ماں باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔ کیونکہ ماں باپ تو فقط ظاہری سبب ہیں، بچے کا وجود وعدم دونوں ان کے اختیار میں نہیں۔ اس کے برعکس ذاتِ باری تعالیٰ مخلوق کے لئے علتِ کاملہ (Prime Cause) ہے۔

جب تک بچے کا وجود اس عالم میں ظاہر نہیں ہوتا تو ماں باپ اس کی تربیت

کے کفیل نہیں ہو سکتے ---اس کی صورت کا نقشہ عجیب و غریب انقلابات کے بعد کس کے ارادے اور قدرت سے کھینچا جاتا ہے؟ اس نقشہ میں روح اور عقل ڈال کر کون اس کو منصبِ انسانیت عنایت کرتا ہے؟ ماں کے پیٹ میں کون مناسب غذا پہنچاتا ہے؟ پھر اس عالم میں آنے کے بعد اس کی ضروریاتِ زندگی ہوا، پانی وغیرہ جو انسانی مداخلت سے بالکل باہر ہوتی ہیں، اس کے لئے کون مہیا کرتا ہے؟

کیا ماں باپ کی محبت اور رحمت ان مواقع میں کچھ کام دے سکتی ہے؟---

ہرگز نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ اور عنایت شاملہ ہی سے یہ سب امور طے ہوتے ہیں اور سب اللہ تعالیٰ کی رحمت و محبت کے ثمرات و آثار ہیں۔

اس لئے اسرارِ الٰہیہ (Divine Secrets) کے عالم اتم علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اور اس کی مہربانی اپنی مخلوق پر ماں باپ کی اپنی اولاد پر مہربانی سے بہت زیادہ ہے۔ جب ماں باپ اپنے چند روزہ عارضی تعلق کی وجہ سے اپنی اولاد کو بے کار چھوڑنا پسند نہیں کرتے اور اس کی ظاہری و باطنی آراستگی و پیراستگی کے لئے ہر طرح کے اسباب مہیا کرتے ہیں، تو یہ کیسے اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہو سکتا ہے کہ انسان کو، جو اس کی تمام مخلوق میں سے اشرف اور زیادہ محبوب مخلوق ہے، بے کار چھوڑ دے اور اس کے ظاہری نقش و نگار اور مادی پہلو کے حسن و جمال کے اسباب تو پیدا کر دے لیکن اس کی باطنی اور روحانی سطح کی اصلاح اور آراستگی کی جانب کوئی توجہ نہ کرے اور اس کو ویسے ہی مہمل (Trashy) اور بلا تربیت چھوڑ دے۔

فی الاصل انسان کا اصلی شرف اور امتیاز اس کی باطنی سطح کی طہارت و تہذیب پر مبنی ہے۔ لہٰذا شایانِ شانِ خداوندی اور تقاضائے رحمت لامتناہیہ یہی تھا کہ اس کی باطنی طہارت و تربیت کے لئے اپنے ایسے قابل بندوں کو منتخب فرمائے جن میں اسرارِ الٰہیہ اور معارفِ ربانیہ (Divine Knowledges) سمجھنے کی کافی قابلیت ہو اور

جن کی تربیت وتہذیب کی قوتِ روحانیہ، مادی تصادم سے متاثر ہو کر کمزور نہ پڑ گئی ہو؛ بلکہ ان کی قوتِ روحانیہ اس قدر منور اور قوی ہو کہ اس کے آگے مادی قویٰ بالکل مغلوب اور مسخر ہو گئے ہوں، تاکہ وہ اپنی روحانی قوت کے ذریعے روحانی عالم (Spiritual world) سے علوم ومعارف حاصل کر کے اس مادی اور ظلمانی عالم کو روشن کر دیں۔

{ب} انسان کا تعلق دو چیزوں سے ہے۔ ایک اس کا تعلق اس عالمِ مادی سے ہے--- یہ تعلق تدبیر وتصرف کا ہے اور یہ فانی اور عارضی ہے۔

دوسرا تعلق اس کا اپنے خالق ومالک سے ہے جس کے اختیار میں اس کا وجود اور عدم ہے--- یہ تعلق اطاعت اور غلامی کا ہے اور یہی تعلق اصلی اور دائمی ہے، جو مادی تعلق سے بدرجہا ارفع واعلیٰ ہے۔

چونکہ اس نفیس اور پاکیزہ تعلق میں ترقی کرنے کے لئے مادی علوم کا مطالعہ کافی نہیں ہوسکتا؛ بلکہ مادی علوم کے مطالعہ میں توَغُّل (Absorption) اور انہماک، اس سچے اور حقیقی تعلق کے ضعف کا باعث ہوتا ہے--- جتنا یہ مادی تعلق بڑھتا چلا جاتا ہے، اتنا ہی اس حقیقی اور پاکیزہ تعلق سے غفلت اور دوری پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا اس سچے اور پاکیزہ تعلق کے حقوق صادقہ سمجھنے کے لئے اور ان میں ترقی کرنے کے لئے، ان مادی علوم کے علاوہ دوسرے معارف اور علوم کا ہونا ضروری ہے جن کی بدولت انسان اپنے حقیقی اور اصلی تعلق کے حقوق وفرائض سے واقف ہو اور اپنے اصلی مالک کی غلامی اور اطاعت کو مکمل طور پر بجالا کر اس کی نزدیکی اور قرب کے قابل ہو جائے۔

نبوت کا مقصد اور رسالت کا ثمرہ ایسے ہی الٰہی علوم ومعارف کی اشاعت ونشر ہے۔

{ج} انسان کے شرف اور فوقیت کا دارومدار علم پر ہے اور علم کی فوقیت

(Superiority) اور دنائت (Inferiority) اس کے معلوم (Information) کے لحاظ سے ہؤا کرتی ہے۔ اگر معلوم اعلیٰ اور نفیس ہوتو اس کا علم بھی قابلِ قدر اور اعلیٰ شمار کیا جاتا ہے اور اگر معلوم ادنیٰ اور معمولی حیثیت کا ہوتو اس کا علم بھی قابلِ قدر نہیں سمجھا جاتا۔ جس قدر کسی انسان کی معلومات اعلیٰ اور پاکیزہ ہوں، اسی قدر وہ انسان قابلِ قدر اور قابلِ وقعت سمجھا جائے گا۔ اور موجودات میں سب سے اعلیٰ اور پاکیزہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ کیونکہ یہی ذات اصلی اور حقیقی موجود ہے، باقی تمام موجودات عارضی وجود سے موجود ہیں، اس لئے انسان کی شرافت اور رفعت کا انتہائی زینہ اس ذات کا علم ہے--- جتنا انسان کا علمی تعلق اس ذات سے زیادہ اور صحیح معیار پر ہوگا، اتنا ہی وہ انسان زیادہ قدر و منزلت کے قابل ہوگا، اور جتنا انسان اس ذات کے علم اور معرفت سے دور ہوگا، اتنا ہی وہ انسانی شرافت کے معیار سے گراہؤا سمجھا جائے گا--- لیکن اس اعلیٰ زینہ شرافت تک کیسے رسائی ہو اور اس کے لئے کیا اسباب درکار ہیں؟

ظاہر ہے کہ عقل کی رہبری یہاں پر کار آمد نہیں ہوسکتی۔

اولاً، اس لئے کہ اس مادی دنیا میں یہ عقل مادیات سے ایسی مالوف و مانوس ہوگئی ہے کہ اسے غیر مادی جانب توجہ کرنے سے وحشت و اضطراب پیدا ہوتا ہے۔

ثانیاً، اس لئے کہ قوتِ وہمیہ اس پر ایسی غالب ہے کہ روز و شب وقوع پذیر ہونے والے مادی واقعات کی صحیح جانچ کرنے کے باوجود بعض مرتبہ قوتِ وہمیہ کے تصادم سے بہت پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور بعض مواقع پر تو عقل انتہائی واضح دلائل کو چھوڑ کر قوتِ وہمیہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے۔ علاوہ ازیں امراض و حوادث کی وجہ سے عقلِ انسانی ایک حالت پر مستقیم نہیں رہ سکتی۔ یہی سبب ہے کہ فیثاغورث اور سقراط جیسے روشن دماغ فلاسفروں نے اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ عقلی پرواز سے ذاتِ باری تعالیٰ بہت فوق الفوق اور ارفع ہے۔ ارسطو

کہتا ہے کہ جیسے چمگادڑ سورج کو دیکھنے سے قاصر ہے، ویسے ہی عقل اللہ تعالیٰ کی ذات کے ادراک سے عاجز و قاصر ہے۔

لہٰذا انسان ان مادی ظلمات میں مقید ہوتے ہوئے اپنی کسی ذاتی رائے کی روشنی میں اس اشرف و اعلیٰ زینہ تک نہیں پہنچ سکتا---اب یہ تو ممکن نہیں کہ جس ذات نے ظاہری صورت کے لحاظ سے انسان کو اعلیٰ زینے تک پہنچایا، وہ اس کی باطنی استعداد کو، جو اس کی شرافت کا اصلی معیار ہے، باوجود علیم، کثیر الجود، وسیع القدرت اور کثیر الرحمت ہونے کے، اعلیٰ زینہ تک پہنچنے سے محروم رکھے۔

لہٰذا اس کی صفاتِ کاملہ کا یہی تقاضا ہے کہ اپنی رحمتِ کاملہ سے اس اعلیٰ شرف اور کمال تک پہنچانے کے لئے کوئی ذریعہ اور سبب پیدا کرے---اسی ذریعہ و سبب کو الہام اور وحی کہا جاتا ہے۔ اس الہام اور وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات کی تشریح کرتا ہے اور اس کے ذریعے انسان کو ان حقوقِ ربوبیت سے جو اس پر واجب الادا ہیں، مطلع کرتا ہے۔ پھر فطرتاً چونکہ انسانی افراد مختلف القابلیت ہیں، اس لئے جن افراد کی قوتِ روحانیہ اعلیٰ درجے کی تھی اور ان میں وحی اور الہام کو سمجھنے کی کافی قابلیت موجود تھی، انہیں وحی اور الہام کے ذریعے نہایت واضح اور روشن احکام دے کر انسانوں کی اصلاح کے لئے مقرر کیا گیا۔ انہی منتخب بندوں کو انبیاء اور رسل کہا جاتا ہے۔

{د} انسانی دنیا کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی ہوشیار اور دانشمند انسان اپنے زیرِ اثر حلقہ کی بدتہذیبی اور آوارگی پسند نہیں کرتا؛ بلکہ اس کی شفقت اور رحمدلی کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اس کے متعلقین قابل اور مہذب بن جائیں، اسی لئے وہ انہیں نصیحت کرتا ہے اور بُرے کاموں سے روکتا ہے۔

جب ایک انسان اپنے متعلقین اور زیرِ اثر حلقہ کی بدتہذیبی اور ناشائستگی پسند نہیں کرتا اور ان کی بدتہذیبی اور لاقانونیت کو تعلیمی وانتظامی لیاقت کے خلاف ایک چیلنج

سمجھتا ہے تو اللہ تعالیٰ جو سب کمالاتِ انسانی کا خالق ہے اور تمام صفاتِ کمالیہ کا مالک ہے، اس کے شایانِ شان یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو، جسے وہ محض اپنی رحمتِ کاملہ سے ظلمتِ عدم سے نورِ وجود میں لایا ہے، تہذیب و تربیت کے بغیر آوارہ، بے کار اور مہمل چھوڑ دے؟

اسی مصلحت اور حکمت سے اس نے اپنے پاکیزہ بندوں کو منتخب کر کے انسانی عالم کی تہذیب اور شائستگی کے لئے مناسب احکام اور قوانین دے کر مقرر فرمایا ہے۔

{ہ} ہمیشہ سے یہ قانون چلا آتا ہے اور بالخصوص زمانۂ حاضرہ میں اسے زیادہ قابلِ عمل سمجھا جارہا ہے کہ جب کسی مسئلے میں اختلاف اور نزاع پیدا ہو جائے تو حق کی پہچان کا معیار کثرتِ رائے کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ جس جانب کثرتِ آراء ہو اس کو حق بجانب تسلیم کر کے اس کے مطابق بڑی بڑی حکومتوں کے فیصلے کیے جاتے ہیں اور قلتِ رائے والوں کو اپنی رائے چھوڑ کر آخر کثرتِ رائے والوں سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ اسی مسلّم قانون کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم رسالت کے مسئلہ کا بھی بخوبی تصفیہ کر سکتے ہیں۔

موجودہ دنیا میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو نبوت کے قائل ہیں۔ گو ان کا آپس میں شخصی نبوت کے لحاظ سے اختلاف ہے --- کوئی عیسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہے، کوئی موسیٰ علیہ السلام کو اور کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہے۔ کوئی کرشن کا ماننے والا ہے اور کوئی زردشت کا مقلد ہے [1] لیکن نفسِ رسالت مِن جانب اللہ ہونے کے سب قائل ہیں۔

---

[1] ← عیسیٰ علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، کرشن اور زردشت، ان چاروں کے تذکرے مندرجہ ذیل ہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام

عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول تھے۔ عبرانی نام یسوع، بمعنی سردار ہے۔ عیسیٰ اسی کا ☜

جولوگ لامذہب، دہریہ یا منکرِ نبوت ہیں، وہ ان کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسا کہ آٹے میں نمک۔

لٰہذا قانونِ مذکورہ بالا کا لحاظ کرتے ہوئے نبوت کا تسلیم کرنا ضروری ہے۔

معرب ہے۔ آپ جودیا (جنوبی فلسطین) میں بیت اللحم کے مقام پر کنواری مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ حضرت مریم اللہ کے حکم سے حاملہ ہوئیں۔ اسی لئے مسیحی حضرات عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ لیکن مسلمان اس عقیدے کے قائل نہیں۔ وہ آپ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں۔

پیدائش کے بعد آپ سے متعدد معجزات مثلاً گہوارے (Cradle) میں باتیں کرنا وغیرہ کا ظہور ہوا۔ لوگوں کی طعن و تشنیع کے ڈر سے حضرت مریم آپ کو لے کر گلیلی کے ایک قصبے نزارت (ناصرہ) چلی گئیں اور وہیں آپ نے پرورش پائی۔ آپ تقریباً دو تین سال، اپنے بارہ حواریوں (شاگردوں) کے ہمراہ فلسطین کے قریے قریے میں گھومتے پھرے اور یہودیوں کی دین حق کی طرف بلاتے رہے۔ ہزاروں غریب اور مظلوم لوگ جو یہودی سرمایہ داروں، مذہبی پیشواؤں اور رومی حاکموں (فلسطین سلطنت روما کے زیر نگیں تھا) کے جبر و استبداد (Oppression and Tyranny) کی چکی میں پس رہے تھے، آپ کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ انہیں آپ کی ذات میں وہ مسیحا نظر آیا جس کی بشارت تورات میں دی گئی تھی۔

یہودیوں کے اونچے طبقے اور مذہبی پیشواؤں کو آپ کے روپ میں اپنی موت نظر آئی۔ چنانچہ انہوں نے آپ پر اپنی مذہبی عدالت میں کفر کا مقدمہ چلایا اور رومی گورنر نے یہودی امرا کے زور دینے پر آپ کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ لیکن قرآن میں ہے کہ نہ آپ قتل کیے گئے اور نہ سولی پر چڑھائے گئے۔ دشمنوں نے آپ کے دھوکے میں کسی دوسرے شخص کو مصلوب کر دیا، اور آپ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت کے قریب آپ دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے، اسلام کا اتباع کریں گے اور چالیس سال زندہ رہنے کے بعد فوت ہوں گے۔

موسیٰ علیہ السلام

موسیٰ علیہ السلام (عہد ۱۵۷۱۔۱۴۵۱ ق م) بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر تھے۔ مصر (Egypt)

سوال ۵ ۳۸

کیا انبیائے کرام علیہم السلام کی کوئی تعداد یقینی طور پر ثابت ہے کہ نہیں؟

میں پیدا ہوئے۔ فرعون کو معلوم ہو گیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جو اس کی بربادی کا باعث ہوگا، اس لئے وہ بنی اسرائیل کے سب لڑکوں کو قتل کرا دیتا تھا۔ لہٰذا آپ کی والدہ نے آپ کو ایک صندوق میں بند کر کے دریائے نیل (The Nile) میں بہا دیا جو فرعون کی ملکہ کی نظر سے گزرا اور اس نے بطور فرزند کے پالا۔ بڑا ہونے پر آپ نے قبطی کے مقابلے میں ایک بنی اسرائیلی کی حمایت کی جس میں قبطی مارا گیا۔ اس پر آپ مصر سے بھاگ کر مدین پہنچے، جہاں حضرت شعیب علیہ السلام نے آپ کو اپنے ہاں رکھا اور اپنی بیٹی کی شادی آپ سے کر دی۔ بارہ برس کے بعد جب آپ واپس آرہے تھے تو وادی ''طوٰی'' میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام فرمایا اور آپ کو پیغمبری عطا ہوئی۔ آپ کو فرعون کی ہدایت کے واسطے متعین کیا گیا، اور عصا اور ید بیضا کے معجزات عطا ہوئے۔ فرعون اپنے جادوگروں کو آپ کے مقابلے میں لایا مگر وہ سب اپنے آپ کو عاجز پا کر ایمان لے آئے۔ بعد ازاں آپ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے۔ راستے میں دریا پڑتا تھا۔ حکم ربی کے تحت آپ نے اس پر عصا مارا، وہ دو حصوں میں بٹ گیا اور دریا میں ایک راستہ سا بن گیا۔ فرعون بھی آپ کے تعاقب میں چلا آرہا تھا۔ جب وہ دریا پر پہنچا اور ایک راستہ بنا پایا تو بلا جھجک آپ کے پیچھے ہی اپنے لاؤ لشکر سمیت دریا میں اتر گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اپنے ساتھیوں سمیت پار اتر گئے، مگر فرعون اپنے تمام لشکر کے ساتھ دریا میں غرق ہو گیا۔

کرشن

کرشن سے مراد شری کرشن ہیں جنہیں بعض ہندو اوتار مانتے ہیں۔ زمانہ قبل از تاریخ کی ایک کہانی کے مطابق دریائے جمنا کے کنارے شہر متھرا میں ایک ظالم راجا کنس حکمران تھا۔ اس کو نجومیوں نے اطلاع دی کہ تمہاری بہن ''دیو کی'' کا ایک لڑکا تم کو قتل کرے گا۔ اس لئے بہن کے جو بچے ہوتے راجا ان کو

۵ جواب ۳۸

یقینی طور پر کوئی تعداد ثابت نہیں ؛ البتہ بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرامؑ دنیا میں تشریف لائے۔ جن میں تین سو تیرہ (313) رسول ہوئے

قتل کرا دیتا۔ اس طرح دیوکی کے سات بچے موت سے ہم آغوش ہو چکے تو آخری ولادت کے وقت گوکل کی ایک گوالن جسودھا نے اپنی بچی سے دیوکی کے بچے کو بدل لیا۔ اس طرح یہ بچہ گوالوں میں پرورش پا کر جوان ہوا۔ راجا کنس کے مظالم سے رعایا بیزار تھی۔ اس کو اسی بچے نے جو جسودھا کی گود کا پروردہ اور دیوکی کا لڑکا تھا، قتل کیا اور اس کے باپ کو قید سے آزاد کر کے تخت نشین کیا۔ بعد میں یہی بچہ شری کرشن کے نام سے مشہور ہوا۔

شری کرشن لڑکپن اور نوجوانی میں، گوکل کے بن میں، گائیں چراتے تھے۔ ان کی بنسری کی مدھر تانیں سن کر ارد گرد کی گوالنیں دیوانہ وار ان کی طرف کھنچی چلی آتیں۔

ہندو کرشن جی مہاراج کو وشنو کا آٹھواں اوتار کہتے ہیں۔ بعض مسلمان علماء انہیں پیغمبر مانتے ہیں اور لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (ہر قوم میں ایک ہادی بھیجا گیا) سے استدلال کرتے ہیں۔ حسرت موہانی نے ان کی شان میں منقبتیں لکھی ہیں اور ان کے نام کے ساتھ علیہ السلام تحریر کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب.

زرتشت

زرتشت (Zartusht) (۶۶۰۔۵۸۳ ق م) قدیم ایران کا مفکر اور مذہبی پیشوا۔ آذربائجان کے مقام گنج میں پیدا ہوا۔ جوانی گوشہ نشینی، غور و فکر اور مطالعے میں گزری۔ سات بار بشارت ہوئی۔ تیس سال کی عمر میں اہورا مزدا یعنی خدا کے وجود کا اعلان کیا لیکن وطن میں کسی نے بات نہ سنی۔ تب مشرقی ایران کا رخ کیا اور خراسان میں کشمار کے مقام پر شاہ گستاسب کے دربار میں حاضر ہوا۔ ملکہ اور وزیر کے دونوں بیٹے اس کے پیرو کار ہو گئے۔ بعد ازاں شہنشاہ نے بھی اس کا مذہب قبول کر لیا۔ آج کل اس کے پیرو، جنہیں پارسی کہا جاتا ہے، ہندوستان، پاکستان، افریقہ، یورپ میں بہت قلیل تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

ہیں۔لیکن یہ روایات یقینی طور پر ثابت نہیں ہیں ؛ بلکہ ان کا ثبوت ظنی ہے اور عقاید میں ظنی دلیل سے کام نہیں لیا جا سکتا۔اس کے لئے یقینی دلیل درکار ہوتی ہے جو قرآنی نص (Quranic Evidence) یا متواتر احادیث (Successive Traditions) ہی ہو سکتی ہیں۔اس لئے کسی تعداد کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

سوال ۶ ۳۹

کیا نبی اور رسول میں کچھ فرق ہے؟

جواب ۶ ۳۹

ہاں، جمہور کے نزدیک نبی عام ہے اور رسول خاص۔نبی اسے کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعہ قوم کی ہدایت کے لئے مقرر فرمائے خواہ اسے کوئی جدید شریعت اور نئی کتاب دے کر بھیجا جائے یا سابقہ شریعت کی طرف قوم کو توجہ دلانے کے لئے مقرر کیا جائے ؛ جبکہ رسول خاص اسی کو کہیں گے جو نئی کتاب اور جدید شریعت کے ساتھ بلحاظ مناسبتِ زمانہ قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا جائے اور بعض اس کے برعکس

زرتشت ثنویّت (Ditheism) کا قائل تھا۔اس کا دعوٰی تھا کہ کائنات میں دو طاقتیں (یا دو خدا) کارفرما ہیں۔ایک اہورامزدا (یزداں) جو خالق اعلیٰ اور روح حق وصداقت ہے اور دوسری اہرمن جو بدی، جھوٹ اور تباہی کی طاقت ہے۔ان دونوں طاقتوں یا خداؤں میں ازل سے کشمکش چلی آ رہی ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔جب اہورامزدا کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے تو دنیا امن وسکون اور خوشحالی وشادمانی کا گہوارہ بن جاتی ہے اور جب اہرمن غالب آ جاتا ہے تو دنیا فسق وفجور، گناہ وعصیاں اور اس کے نتیجے میں آفاتِ ارضی وسماوی کا شکار ہو جاتی ہے۔زرتشت نے اہورامزدا کے لئے آگ کو بطور علامت استعمال کیا کیونکہ یہ ایک پاک وطاہر شئے ہے اور دوسری چیزوں کو بھی پاک وطاہر کرتی ہے۔پارسیوں کے معبدوں اور مکانوں میں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے۔غالبًا اسی لئے انہیں آتش پرست کہا جاتا ہے۔عرب انہیں مجوسی کہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ رسول کو عام اور نبی کو خاص قرار دیتے ہیں۔ ①

سوال ۷ ۴۰

سب سے اول نبی کون ہوئے ہیں اور سب سے آخر کون؟

جواب ۷ ۴۰

سب سے اول نبی ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام ہوئے ہیں اور سب سے آخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور پرُنور ہوا ہے۔

سوال ۸ ۴۱

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر کیا دلیل ہے؟

جواب ۸ ۴۱

{الف} حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی روشن دلیل قرآن مجید ہے۔

اولاً، اس لئے کہ قرآن مجید ایک ایسا کلام ہے کہ انسان اسے سن کر بآسانی یہ یقین کرلیتا ہے کہ یہ کلام انسانی کلام سے بالکل جدا اور ممتاز ہے اور انسانی کلام کے ساتھ اس کی کوئی مناسبت اور مشابہت نہیں۔ مگر جس کسی کو تعصب یا جہالت یہ بات سمجھنے کا موقع نہ دے تو وہ اس طرح سے سمجھ سکتا ہے کہ کسی نہایت فصیح البیان عربی کتاب کی چند عبارتیں کسی سے پڑھوا کر سنے اور پھر قرآن مجید کی بھی چند آیتیں پڑھوا

---

① ← مگر درحقیقت یہ اختلاف نزاعِ لفظی ہے۔ کیونکہ جو لوگ نبی کو عام کہتے ہیں اور رسول کو خاص، وہ اس بنا پر کہ نبی کے لئے کتاب ضروری نہیں ہے؛ جبکہ رسول کے لئے کتاب ضروری ہے۔ اس لئے ہر رسول نبی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ اور جو لوگ رسول کو عام کہتے ہیں، وہ اس بنا پر کہ رسول کا اطلاق فرشتوں پر بھی ہوتا ہے؛ جبکہ نبی ہر حال میں انسان ہی ہوتا ہے۔ [دائم]

کرسنے ---خواہ مطلب سمجھ سکے یا نہ --- تو خود بخود اس کے پاکیزہ الفاظ اور عبارت کی حسین طرز وروش سے اس کو یقین آجائے گا کہ یہ کلام انسانی کلاموں سے بالکل ممتاز اور جدا اثر رکھتا ہے، جس سے بشری طاقتیں قطعاً عاجز ہیں۔ضرور یہ بے مثال کلام ایسی ذات کا ہے جو یکتا، بے نظیر اور لاشریک ہے اور جس بندے کو اس وحدہٗ لاشریک نے اس بے نظیر کلام سے مشرف کیا ہے، ضرور وہ بھی نوعِ انسانی میں سب سے ممتاز اور بے مثال فرد ہے۔

ثانیاً، اس لئے کہ کلام مجید اپنے صوری اور معنوی اعجاز کے لحاظ سے انسانی قدرت سے مافوق ہے۔تیرہ سو برس سے زائد زمانہ گذر چکا ہے کہ قرآن مجید برابر اپنے مِنْ جَانِبِ الله (اللہ کی طرف سے) ہونے کا دعویٰ کرتا آرہا ہے اور واشگاف الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ اگر میں من جانب اللہ نہیں ہوں، کسی بشر کا کلام ہوں، تو روئے زمین کے تمام بشر مل کر میرے ایک چھوٹے سے حصے کی نظیر بنا کر لائیں۔اگر نہیں لا سکتے تو یقینی طور پر سمجھ لیں کہ جب سب بشری قوتیں اس امر سے عاجز ہیں تو ضرور یہ کلام بشر کا نہیں ہے---خصوصاً ایسے انسان سے جو رسمی نوشت وخواند (لکھنے پڑھنے) سے بھی قطعاً ناواقف ہو، ایسے کلام کا صدور یقیناً اس بات کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ یہ کلام اس کا اپنا نہیں؛ بلکہ اللہ وحدہٗ لاشریک کا ہے۔اور جس انسان کو اللہ تعالیٰ اپنا کلام دے کر قوم کی ہدایت کے لئے مقرر فرماتا ہے اسی کو رسول کہا جاتا ہے۔لہٰذا آپ ﷺ کا رسول ہونا نہایت واضح ہے۔

{ب} چونکہ نبوت کا اصلی مقصد روحانی ترقی ہے، نہ کہ مادی ترقی، کیونکہ انسان مادی ترقی عقل، حواس خمسہ اور مادی آلات کے ذریعہ کرسکتا ہے، لیکن روحانی ترقی کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔روح اس مادی عالم میں ماحول کے اثرات سے ایسی متاثر ہو کر رہ گئی ہے کہ مادیات کے عشق میں سوائے مادیات محسوسہ

اور کسی شے کو تسلیم کرنا پسند نہیں کرتی۔

انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے سے یہی مقصد ہے کہ انسان اس دنیوی، ناپائدار جنونِ عشق سے تعلق منقطع کر کے، اس کو اصلی اور دائمی عشق، یعنی عشقِ الٰہی کی جانب متوجہ کیا جائے اور حضور ﷺ نے بذریعہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ جس قدر مفصل اور عمدہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی تشریح فرمائی ہے ویسی کسی سابق نبی یا کتاب نے نہیں کی۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق قرآن مجید کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، آیت الکرسی، سورہ حدید کی ابتدائی آیات اور سورۃ حشر کی آخری تین آیات کو ملاحظہ فرمایئے (1) کن مختصر الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے متعلق بہترین اور جامع

---

(1)← سورۂ اخلاص اور دیگر آیاتِ مبارکہ مع ترجمہ درج ذیل ہیں۔

سُوْرَةُ الْاِخْلَاص

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۝﴾

﴿ کہو، وہ اللہ ہے، یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔﴾

آيَةُ الْكُرْسِيّ

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ۝﴾ [البقرة، آية ٢٥٥]

﴿اللہ، وہ جاوید ہستی ہے، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے ☜

تشریح کی گئی ہے۔قرآن مجید کے علاوہ سابقہ الہامی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی تشریح اس پاکیزگی اور عمدگی سے نہیں مل سکتی۔

اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفتِ ادراک میں نہیں آسکتی اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی انہیں دینا چاہے۔اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔

آیاتُ سُورَۃِ الْحَدِید

﴿ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَهُوَالْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ o لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ج وَهُوَعَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ o هُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ج وَهُوَبِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ o هُوَالَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ط یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَایَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ط وَهُوَمَعَکُمْ اَیْنَ مَاکُنْتُمْ ط وَاللّٰهُ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ o لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَ اِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ o یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ ط وَهُوَعَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ o ﴾

[الحدید، آیة ۱ تا ۶]

اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو زمین اور آسمانوں میں ہے، اور وہی زبردست اور دانا ہے۔زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک وہی ہے، زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے، اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔وہی اوّل بھی ہے اور آخر بھی، اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی، اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا۔اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے۔وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے۔وہی زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات فیصلے کے لئے اسی کی طرف رجوع کئے جاتے ہیں۔وہی رات

ایسے ہی احادیث شریفہ میں اللہ تعالیٰ کے متعلق جو بسط وشرح سے وضاحت کی گئی ہے، اسے پڑھ کر انسانی عقل حیران ہو کر رہ جاتی ہے۔

غرضیکہ مقصدِ نبوت کو آنحضرت ﷺ نے بہ نسبت سابقہ انبیاء کے زیادہ درجۂ کمال تک پہنچایا ہے۔ اس لئے آپ ﷺ کی نبوت ان کی نبوت کی بہ نسبت بدرجۂ اولیٰ واجب التسلیم ہے۔

{ج} جب انسانی ماحول، جہالت اور کبائر کی غلاظتوں سے بھر جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کے لئے انسانی افراد میں سے قابل انسانوں کو منتخب فرما کر قوم کی اصلاح کے لئے مقرر فرماتا ہے۔

جس زمانہ میں حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی اس زمانہ میں قوم عرب

کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ ﴾

آیاتُ سُوْرَةِ الْحَشْر

﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ○ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ ﴾ [الحشر، آیة ۲۲ تا ۲۴]

﴿ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا، وہی رحمٰن اور رحیم ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے، نہایت مقدس، سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، سب پر غالب، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا، اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا۔ پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے لئے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے، اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔ ﴾ §

کی جہالت اور برائیاں ایسی حد تک پہنچ چکی تھیں کہ سابقہ تاریخ ان کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ لہٰذا ایسی تاریکی میں شمعِ نبوت کی سخت ضرورت تھی۔ یہ قاعدہ ہے کہ جس جگہ زیادہ غلاظت ہوتی ہے اس کا صاف کرنا زیادہ اہم اور قابلِ توجہ ہوتا ہے، اس لئے سرزمینِ عرب میں نورِ رسالت کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ حضور ﷺ کی پاکیزگیٔ اخلاق، صداقت اور امانت بچپن سے ہی مسلّم اور شہرۂ آفاق تھی۔ آپ ﷺ فطرتاً قومِ عرب کے نزدیک ہر نقص وعیب سے پاک تسلیم کئے جاتے تھے--- تاریخ اس پر شاہد ہے۔

لہٰذا ان مجموعہ مصدقہ اور متیقنہ امور پر غور کرنے سے تعصب سے پاک طبیعت اس بات کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ اس زمانہ میں رسالت کی شدید ضرورت تھی اور اس کے آپ ﷺ ہی مستحق تھے۔

سوال ۹ ۴۲

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی پاکیزگی، صداقت اور دیانت بچپن سے ہی مسلّم تھی اور قومِ عرب کے نزدیک آپ ﷺ ہر عیب سے پاک سمجھے جاتے تھے۔ حالانکہ قرآن مجید میں آپ ﷺ کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے ''وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی'' [الضحیٰ، آیۃ ۷] (اور آپ کو بھٹکا ہوا پایا تو آپ کو سیدھا راستہ دکھا دیا)، اور مذکورہ بالا بیان اس کے منافی ہے؟

جواب ۹ ۴۲

یہ دھوکہ اس لئے ہو گیا ہے کہ ضال کے معنی گمراہ اور بھٹکا ہوا سمجھ لئے گئے

ہیں، حالانکہ لفظ ضلال کے معنی صِلہ (Context) کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ جیسے اس آیت "اِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ" [السجدہ، آیۃ ۱۰] (جب ہم زمین میں نابود ہو جائینگے) میں چونکہ فِی صلہ واقع ہوا ہے اس لئے اس کے معنی نابود اور فنا ہونے کے ہیں اور "ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ" [النحل، آیۃ ۱۲۵] میں اس کے معنی عَنْ کی وجہ سے بھٹکنے کے ہیں۔

سورۃ والضحٰی میں اس کا صلہ عــــن نہیں آیا تا کہ اس کے معنی گمراہ اور بھٹکے ہوئے کئے جائیں، اس لئے ہمارے بیان کا قرآن مجید کے ساتھ کوئی تضاد نہیں۔

اس آیت کے صحیح معنی وہ ہیں جو امین الامت حضرت ابو عبیدہؓ ① سے مروی ہیں۔ فتوح الشام، ② ج سوم، صفحہ ۲۱۵، پر ہے کہ

"ایک موقع پر جب ایک عیسائی راہب نے حضرت ابو عبیدہؓ سے اس آیت کے معنی دریافت کئے تو آپؓ نے فرمایا "معاذ اللہ! اس کے معنی گمراہ کے نہیں کیونکہ حضور اقدس ﷺ کی شان اس سے بہت بڑی ہے؛ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے آپ ﷺ کو اپنی محبت کی وادی میں گھومتا ہوا گم پایا تو اپنے مشاہدے کا راستہ آپ کو دکھایا۔ یا یہ کہ آپ کو ہم نے بحارِ طلب میں متلاشی دیکھا تو آپ کو ساحلِ حق پر لگا دیا۔"

---

① ← ابو عبیدہؓ بن الجراح کا نام عامر بن عبداللہ ہے۔ ابتدا ہی میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ بہادری، خلوص اور ایثار میں ممتاز تھے۔ آنحضرت ﷺ ان کو الامین کہا کرتے تھے۔ تقریباً تمام غزوات میں شرکت فرمائی۔ حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ خلافت میں ایران اور شام کے محاذ پر اسلامی لشکر کی قیادت کی۔ حضرت عمرؓ نے خالد بن الولید کی جگہ اسلامی لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا اور دمشق وحلب وغیرہ انہی کے ہاتھوں فتح ہوئے۔ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ قصبہ اموس (اردن) میں طاعون سے وفات پائی اور دمشق میں دفن ہوئے۔ مزار سے ملحق ایک مسجد ہے جو آپ ہی کے نام سے موسوم ہے۔

② ← مشہور و معروف مؤرخ محمد ابن عمر واقدی کی تصنیف، جس میں فتوحات شام کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

فتوح الشام کی عبارت یہ ہے

''قَالَ یُوقَنَّا ''کَیفَ یَصِفُہٗ بِالضَّلَالَۃِ وَھُوَ عِندَہٗ مُعَظَّمٌ؟ فَقَالَ لَہٗ ''مَعَاذَ اللّٰہ ....! مَعْنَاہُ وَ وَجَدْ نَاکَ ضَالًّا فِیْ تِیْہِ مَحَبَّتِنَا فَھَدَیْنَاکَ اِلیٰ مُشَاھَدَتِنَا. وَ اَیْضًا، وَجَدَکَ ضَالًّا فِیْ بِحَارِ الطَّلَبِ فَاٰوٰکَ اِلیٰ سَوَاحِلِ الْحَقّ.''

۱۰ سوال ۴۳

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معراج کا واقعہ صحیح ہے یا نہیں؟ بصورت اول حالتِ خواب میں یا بیداری میں؟ بصورت ثانی دل سے یا آنکھ سے؟ --- جو بھی صورت اختیار کی جائے، مدلل بیان کی جائے۔

۱۰ جواب ۴۳

معراج کا واقعہ بالکل صحیح ہے اور بحالتِ بیداری آنکھ سے ہوا ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلامِ پاک میں سورۂ بنی اسرائیل کے شروع میں ذکر فرماتا ہے۔

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۝﴾

[بنی اسرائیل، آیۃ ۱]

تمام عیوب سے پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو راتوں رات سیر کرائی، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ ① تک جس کے اردگرد ہم نے برکت رکھی، تا کہ ہم اس کو اپنی

---

① ← مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ۔ علی الترتیب ان کے تذکرے مندرجہ ذیل ہیں۔

مسجد حرام

مسجد الحرام (The Sacred Mosque)، مکہ معظمہ کی مسجد جس کے اندر کعبہ واقع ہے۔ زمزم اور مقام ابراہیم بھی یہیں ہیں۔ فتح مکہ ۸ھ ۶۲۹ء کے بعد اس میں نماز شروع ہوئی۔ لیکن چونکہ جگہ کم تھی اس

نشانیاں دکھائیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا، جاننے والا ہے۔﴾

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے معراج کا ابتدائی واقعہ جو مکہ معظّمہ سے بیت المقدس تک ہوا، بیان فرمایا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ

لئے پہلے حضرت عمرؓ اور پھر حضرت عثمانؓ نے اس میں اضافہ کیا اور اردگرد کے گھروں کو اس میں شامل کر کے چہاردیواری بنوادی۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے دیوار پر چھت ڈلوادی اور خلیفہ مہدی نے دالان اور ستون بنوائے۔ آہستہ آہستہ میناروں کی تعداد سات ہوگئی۔ سلطان سلیم نے سولھویں صدی میں گنبدوں والے برآمدے بنوائے اور عمارت میں ترمیم بھی کرادی۔ اب اس مسجد کو اور بھی وسیع کردیا گیا ہے، اور صفا و مروہ بھی اس کے اندر آگئے ہیں۔

مسجد اقصیٰ

مسجد اقصیٰ (The Farthest Mosque) بیت المقدس کی ایک تاریخی مسجد اور مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے۔ تحویل قبلہ (Change of Qibla) کے حکم سے قبل مسلمان اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام نے اس جگہ ایک چھوٹا سا معبد بنایا تھا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے وسعت دی اور یہ معبد ہیکل سلیمانی کے نام سے موسوم ہوا۔ ۶۳۶ء میں بعہد عمر فاروقؓ عربوں نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو عیسائی بطریقوں (Elders) نے اس شرط پر شہران کے حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ مسلمانوں کا خلیفہ خود وہاں آئے۔ چنانچہ حضرت عمر بنفسِ نفیس بیت المقدس تشریف لے گئے اور عیسائیوں نے شہر کی کنجیاں آپ کو دے دیں۔

فتح بیت المقدس کے بعد حضرت عمرؓ نے ہیکل سلیمانی کے متعلق تحقیق و تفتیش کی اور آخرکار اس کے محل وقوع کا پتا چل گیا۔ خلیفۂ دوم نے اس مقام پر اپنے رفقا کے ساتھ نماز ادا کی اور یہاں لکڑی کی ایک مسجد بنوائی۔ نصف صدی بعد اموی خلیفہ عبدالملک نے اسے پختہ تعمیر کرایا، اور اس کے بعد دیگر خلفاء وسلاطین نے اس میں اضافے کیے۔ صلیبی جنگوں میں اس مسجد کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے بیت المقدس فتح کرنے کے بعد اسے ازسرِنو تعمیر کرایا۔ مسجد کا طول ایک ہزار گز اور عرض سات سو گز ہے۔

نے مسجد کعبہ شریف سے جو حجاز میں ہے، مسجد بیت المقدس تک، جو ملک شام میں ہے اور دونوں کے درمیان سینکڑوں میل کا فاصلہ ہے، ایک رات میں سیر کرائی۔

"سوال"

آیت مذکورہ بالا سے تو اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بیت اللہ سے بیت المقدس تک سیر کرائی۔ ممکن ہے کہ یہ سیر عالمِ خواب میں ہوئی ہو، اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سیر بحالتِ بیداری ہوئی ہے؟

"جواب"

{الف} خواب میں کعبہ شریف سے بیت المقدس تک ایک رات میں جانا کوئی کمال اور قابلِ تعجب بات نہیں ہے۔ خواب میں تو مغربِ اقصیٰ کے لوگ مشرقِ اقصیٰ کی سیر کر سکتے ہیں؛ بلکہ اگر ساری دنیا کی سیر بھی خواب میں ہو جائے تو تعجب نہیں۔ ایسے واقعات تو شب و روز ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اس سے کسی کو انکار ہی کب ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کا اس واقعہ کو اس خصوصیت سے بیان فرمانا کہ پہلے رفع احتمالِ کذب (جھوٹ کا احتمال ختم کرنے) کے لئے سُبْحَانَ کے ساتھ اپنا تزکیہ اور تمام عیوب سے برأت ظاہر فرمانا، پھر اپنی برأت کے بیان میں بجائے اپنے کسی نام مبارک کے اپنی ذات کے لئے کلمہ اَلَّذِیْ لانا، جو اپنے ابہام کی وجہ سے کبریا اور عظمتِ شان پر دلالت کرتا ہے، پھر اس سیر کرانے کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا --- یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تا کہ اس واقعہ عجیبہ و غریبہ سے کسی کو انکار کی جرأت نہ ہو سکے۔ ورنہ سیر کرانے والے کی برأت عن العیوب (تمام عیبوں سے پاک ہونا) اور عظمت قدرت و شان کے اظہار کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ جو چیز واضح ہو اور قابلِ انکار نہ ہو، اس کا بیان اس زبردست تاکید و قوت سے کرنا، قاعدۂ بلاغت کے

خلاف ہے۔

لہٰذا اس قدر تا کید در تا کید سے اس واقعہ کو بیان فرمانا اس امر کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ یہ واقعہ ایسا عظیم الشان اور مافوق العقل ہے کہ غیر تربیت یافتہ عقول اس کو جلدی تسلیم کرنے سے ضرور انکار کرینگے۔ اس انکار کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بیان میں اول جھوٹ وغیرہ تمام عیوب سے علی العموم اپنی براٴت بیان فرمائی اور بعدہٗ اس واقعہ کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔

اس سے ضرور ثابت و متحقق ہوا کہ یہ واقعہ بحالتِ بیداری ہوا ہے، نہ کہ بحالتِ خواب۔

{ب} اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لفظ عبدہٗ استعمال فرمایا ہے۔ اگر حالت خواب میں روح کو بلا جسد مبارک سیر کرائی ہوتی تو عَبۡدِہٖ کا لفظ نہ لایا جاتا؛ بلکہ بِرُوۡحِ عَبۡدِہٖ فرمایا جاتا، کیونکہ عرفاً لفظ عَبۡدُہٗ کا اطلاق فقط روح پر نہیں کیا جاتا؛ بلکہ جسم اور روح کے مجموعے پر ہوتا ہے---قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی یہ لفظ انسان کے لئے استعمال کیا گیا ہے، وہاں اس سے جسم اور روح دونوں مراد لیے گئے ہیں، فقط روح نہیں۔

{ج} قرآن مجید کی تفسیر احادیث مبارکہ ہیں اور صحیح احادیث سے واقعہ معراج کا بحالتِ بیداری ہونا ثابت ہے۔

۱۲ سوال ۴۵

قرآن مجید کی بعض آیات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

﴿ وَمَا جَعَلۡنَا الرُّؤۡيَا الَّتِیۡۤ اَرَيۡنٰکَ اِلَّا فِتۡنَةً لِّلنَّاسِ ﴾ [بنی اسرائیل، آیة ٦٠]

﴿ یعنی ہم نے آپ کے خواب کو نہیں بنایا مگر لوگوں کا امتحان ﴾

دیکھئے، اس آیت میں لفظ رُؤیَا مذکور ہے جس کے معنی خواب کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ بحالتِ خواب ہوا ہے؟

۱۲ جواب ۴۵

{الف} لفظ رُؤیَا کا استعمال جیسا کہ حالتِ خواب کے لئے ہوتا ہے، ویسا ہی اس کا استعمال آنکھوں سے دیکھنے کے لئے بھی ہوتا ہے۔ اور یہاں چونکہ ابتلا اور امتحان مقصود ہے، لہٰذا یہاں یہ معنی لینے ضروری ہیں کیونکہ حالتِ خواب میں مکہ شریف سے بیت المقدس تک جانا اور عجائبات کا مشاہدہ کرنا کوئی قابلِ تعجب شئے نہیں ہے۔ خواب میں تو عجائبات نظر آتے ہی رہتے ہیں، اس سے کسی کو کیا انکار ہو سکتا ہے، اور اس میں ابتلا اور امتحان ہی کیا ہے!؟

{ب} حضرت عبداللہ ابن عباسؓ ① جو علم تفسیر میں سب سے مقدم اور بڑے

---

①← عبداللہ بن عباسؓ آنحضرت ﷺ کے چچازاد بھائی تھے۔ ہجرت سے تین سال قبل مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ بچپن میں ہی نہایت ذہین اور سلجھے ہوئے تھے اور اکثر اپنی خالہ ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کے ہاں رہا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے وقت آپ تیرہ برس کے تھے۔ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں عہد شباب کو پہنچے اور صحابہ کی علمی محفلوں میں شریک ہونے لگے۔ ذی شعور ہونے کے باعث فقہ اور احادیث کے علم میں کمال حاصل کر لیا اور بہت بڑے عالم اور فاضل بن گئے۔ ۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ نے جب کہ وہ محصور تھے، حضرت عبداللہؓ کو امامتِ حج کے فرائض سونپے جو انہوں نے بخیر و خوبی انجام دیئے۔ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں ایران کے حاکم اعلیٰ مقرر ہوئے لیکن ۴۰ھ میں مستعفی ہو کر مکہ میں عزلت نشینی (Retirement) اختیار کر لی۔ ۶۰ھ میں وفات پائی۔ رسول اکرم ﷺ کی احادیث کثرت سے یاد تھیں۔ آپ کی مرویات کی مجموعی تعداد ۲۶۶۰ ہے جن میں سے ۷۵ پر امام بخاری اور امام مسلم دونوں متفق ہیں۔

عالم مانے جاتے ہیں، وہ لفظ رُؤیَا کی تفسیر میں فرماتے ہیں---اَیُ رُؤیَا عَینٍ یعنی آنکھ سے دیکھنا---حضرت ابن عباسؓ اہل زبان ہونے کے ساتھ ساتھ علم تفسیر میں سب کے پیشوا ہیں، لہٰذا یہاں یقیناً آنکھ سے دیکھنا مراد ہے، نہ کہ خواب میں۔

{ج} اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو سورۃ النجم میں لفظ بَصَرُ سے ذکر فرمایا ہے---مَازَاغَ الْبَصَرُ---[النجم، آیة ۱۷] اور ظاہر ہے کہ بصارت آنکھ سے ہوتی ہے، جو حالتِ خواب میں نہیں ہوسکتی۔

***

۞---جی پی فنڈ کی جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟
۞---حج فرض ہے یا نہیں؟
۞---اس پر حکومت کی طرف سے ملنے والا منافع سود ہے یا نہیں؟

عقائد الاسلام کے مصنف علام نے

"التحقیق الصحیح"

میں ان تینوں سوالوں کے ایسے محققانہ جوابات دیئے ہیں کہ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے وفاقی شرعی عدالت نے 1992-08-10 کو ان کے مطابق فیصلہ دیا ہے اور اپنے فیصلے میں التحقیق الصحیح کے طویل اقتباسات شامل کئے ہیں۔
یہ کتاب مع عدالتی فیصلے کے چھپ چکی ہے۔

ملنے کا پتہ
خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ
ہری پور ہزارہ

عقائد الاسلام کے مصنف علام

اپنے متعلقین کے عقائد و اعمال کے اصلاح کے لئے انہیں حسب حال خطوط لکھا کرتے تھے۔
یہ خطوط انتہائی مؤثر و دلپذیر ہیں اور سالکین کی رہنمائی کے لئے بے مثال و بے نظیر ہیں۔

- ---الجھے ہوئے روحانی مسائل کے آسان اور قابلِ عمل حل۔
- ---سالکین کے مشاہدات اور خوابوں کی حیران کن تعبیریں اور تشریحیں۔
- ---حسنِ عمل کی جانب راغب کرنے والی سادہ اور پر سوز باتیں۔
- ---موت، قبر اور حشر کے مراحل سے بسلامت گذر جانے کی تدبیریں۔

غرضیکه

اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے رسول ﷺ کا اتباع کرتے ہوئے قربِ الٰہی کے مدارج طے کرنے کے لئے رہنما کتاب

"مکتوباتِ صدریہ"

کا مطالعہ کیجئے!

(تیسرا ایڈیشن زیرِ طبع)

پانچواں باب

اَلْاِیْمَانُ بِالْیَوْمِ الْاٰخِر

یعنی

روزِ آخرت پر ایمان

قیامت قائم ہونا، لوگوں کا جنت یا دوزخ میں داخل ہونا، نامۂ اعمال ملنا اعمال کا وزن کیا جانا اور عذاب وثواب قبر کی نوعیت کے بارے میں سوالات کے تحقیقی جوابات کے علاوہ تناسخ یعنی آواگون کے باطل ہونے پر ناقابلِ تردید قوی و مستحکم دلائل پر مشتمل، کتاب کا آخری چشم کشا باب۔

فہرست

سوال ۱ ۴۶

قیامت، آخرت اور بعث بعد الموت سے اسلامی اصطلاح میں کیا مراد ہے؟

جواب ۱ ۴۶

سارے عالم کے فنا اور متغیر ہونے کے بعد جب اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دینے کے لئے قبروں سے زندہ کر کے اٹھائے گا، اس حالت کا نام قیامت، آخرت اور بعث بعد الموت ہے۔

سوال ۲ ۴۷

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تمام دنیا فنا ہوجائے اور کوئی چیز موجود نہ رہے، کیونکہ مادہ (Matter) قدیم ہے، نہ وہ فنا قبول کرسکتا ہے اور نہ بغیر کسی صورت کے رہ سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے کوئی نہ کوئی صورت بھی ضرور ہونی چاہیے، اس لئے یہ ناممکن ہے کہ یہ عالم بالکل معدوم محض ہوجائے اور کوئی چیز باقی نہ رہے؟

جواب ۲ ۴۷

مادہ کے حدوث (Ephemerality) اور قِدَم (Eternity) سے بحث کرنا تبھی درست ہوسکتا ہے جب مادہ کی کوئی حقیقت ذاتیہ (Actual Reality) متعین ہوجائے

کیونکہ حقیقت ذاتیہ کا درجہ عوارض و صفات سے مقدم ہے۔ جب تک ذات کی کوئی حقیقت متعین نہ ہو جائے تو اس کی صفات و عوارض سے بحث کرنا فضول ہے؛ جبکہ مادہ کی حقیقت ابھی تک یقینی طور پر ثابت نہیں ہو سکی۔ فلاسفہ قدیم اور جدید سب اس کی تحقیق میں حیران ہیں۔

فلاسفہ قدماء میں سے دیمقراطیس ① وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ مادہ ان اجزاء کا نام ہے جو نہایت باریک ہیں اور ان کی تقسیم ناممکن ہے۔ انہی اجزاء پر عالم مادی کی بناء ہے۔ اسی کو متکلمین اور حکماء جدید (یعنی آج کل کے سائنس دان) بھی مادہ کہتے ہیں۔

ارسطو ②(Aristotle) وغیرہ حکماء مشائیہ (Peripatetics) کہتے ہیں کہ مادہ

---

① ← دی مقراطیس (Democritus) (۴۶۰-۳۷۰ ق م) یونانی فلسفی جسے بابائے طبیعات کہا جاتا ہے۔ تھریس (Thrace) کے شہر ابدیرا (Abdera) میں پیدا ہوا۔ اس نے یونانی فلاسفر (Leucippus) سے متاثر ہو کر عالمی نظریہ جوہری توانائی پیش کیا جس میں اجسام و اجرام کی حرکات و سکنات کی توجیہ بیان کی۔ اس کا نظریہ تھا کہ اجزا یا جوہر یا مادہ (Atom/Matter) ازل سے موجود ہے اور غیر فانی ہے۔ جسامت اور شکل و صورت میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ماہیت کے لحاظ سے یہ ایک ہی ہیں۔ چیزوں کی خاصیتوں میں اختلاف ایک ہی نوعیت کے ذروں کی جسامت، شکل اور حرکت میں اختلاف کا نتیجہ ہے۔ لوہے یا پتھر میں جوہر لرزتے ہیں۔ ہوا میں وہ طویل تر فاصلوں کو طے کرتے ہیں۔ غیر محدود فضا میں جوہر ہر سمت میں حرکت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے ہیں اور مشابہ جوہر یا اجزا ایک دوسرے سے مل کر اجسام بناتے ہیں۔

فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دی مقراطیس کے نظریے کی اگرچہ کوئی حقیقت نہ ہو، مگر یہ نظریۂ جوہر آج کل کے نظریے کے قریب تر ہے۔ اس کی شہرت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ آج تک جوہر فرد کو اجزائے دیمقراطیسی کہتے ہیں۔

② ← ارسطو کا تذکرہ باب نمبر ۳، صفحہ نمبر ۹۴، پر گزر چکا ہے۔

وہ جوہر بسیط (Primary Substance) ہے جو صورت جسمیہ کا محل ہے۔ اس محل اور صورت جسمیہ دونوں کے مجموعہ سے جسم مرکب ہوتا ہے، اور وہ خود جسم نہیں ہے۔

حکماء اشراقیہ (Platonic Scholars) جو بطور کشف و مراقبہ اشیاء کی حقیقت معلوم کرتے تھے، کہتے ہیں کہ مادہ صورتِ جسمیہ ہی کا نام ہے۔ اس کے علاوہ جوہر بسیط اور جزو لایتجزی (Indivisible Particle) وغیرہ کوئی چیز نہیں۔

مادہ کی حقیقت کے متعلق حکماء کے اور بھی بہت سے مذاہب ہیں لیکن مشہور یہی تین ہیں۔ یہ تینوں نظریات ایک دوسرے سے شدید متصادم ہیں۔ ہر ایک فرقے کا دماغ اور عقل اسے اپنے مدعا کو یقینی طور پر صحیح اور دوسرے کے مدعا کو مکمل غلط سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ زمانۂ حال کے مادہ پرستوں نے جب مادہ کی معرفت و ماہیت کے میدان میں اپنی عقلوں کو دوڑایا اور کوئی حقیقت ہاتھ نہ لگی، تو آخر سابقین میں سے متکلمین کی بوسیدہ اور قطعی غلط رائے پر ہی انہیں اکتفا کرنا پڑا۔

ان تینوں مذاہب کے دلائل اور ان کی کمزوری و بے ثباتی کی طرف اگر ہم متوجہ ہوں تو ہمارا کلام بہت طویل ہو جائے گا لہٰذا زمانۂ حال کے مادہ پرستوں کو جو متکلمین کی رائے محبوب و پسند ہے، اس کی بے بنیادی اور بے ثباتی پر اکتفا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بطلان (Negation) پر دو دلائل قطعیہ پیش کیے جاتے ہیں۔

[۱] اقلیدس ① میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر خط قابلِ تنصیف ہے

---

① ← ''اقلیدس'' سے مراد وہ علم جس کی باقاعدہ ابتداء اقلیدس (Euclid) نے کی جو یونان کا ایک ریاضی دان تھا۔ اسے بابائے ریاضیات بھی کہا جاتا ہے۔ ۳۰۰ ق م کے قریب اسکندریہ (Alexandria) میں مقیم تھا۔ جیومیٹری پر اس کی تصنیف کچھ عرصہ پہلے تک سکولوں کے نصاب میں شامل تھی۔ اس کی تصنیف ''اولیات'' (Elements) مباحث یا علم ہندسہ کی قدیم ترین کتاب ہے۔ اولیات کا ترجمہ دنیا کی ☜

(یعنی دو برابر حصوں میں تقسیم کے قابل ہے) اور جب ہم نے ایک خط پانچ اجزاء غیر قابل تقسیم سے فرض کیا تو اس یقینی قانون کے لحاظ سے ضرور یہ خط بھی قابل تنصیف ہوگا۔ اس طرح اس خط کے درمیان میں جو ایک جزو ہے، وہ ضرور نصف ہو جائے گی۔ لہٰذا ایسے جزو کو تسلیم کرنا جو قابلِ تقسیم نہ ہو، قطعاً غلط ہے۔ اس لئے ایسے اجزاء کو مادہ ماننا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

[۲] ایک مثلث قائمہ زاویہ (Right-angle triangle) ہم ایسی فرض کرتے ہیں جس کے دو ضلعے دو دو اجزاء کے ہیں، تو دونوں ضلعوں کے مجموعہ اجزاء تین ہوں گے۔ کیونکہ ایک جزو جس پر دونوں ضلعے آکر ملتے ہیں دونوں میں مشترک شمار کیا جاتا ہے، تو اس صورت میں وتر (Hypotenuse) جو قائمہ (Right Angle) کے مقابلہ کا خط ہے، ضروری ہے کہ دو سے زائد اور تین سے کم ہو، کیونکہ اقلیدس میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وترِ مثلث، مثلث کے ایک ضلع سے بڑا ہوتا ہے اور دونوں کے مجموعہ سے کم ہوتا ہے، تو ضرور ایک جزو کی تقسیم تسلیم کرنی پڑے گی۔ ①

تقریباً تمام بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اقلیدس کی زندگی کے بارے میں بہت کم باتیں معلوم ہیں۔ کہتے ہیں کہ بطلیموس اول کے عہد میں پیدا ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم ایتھنز (Athens) میں پائی۔ ریاضی کی تعلیم اکیڈمی میں حاصل کی۔ علمی سرگرمیوں کا مقام سکندریہ تھا۔

①← اس دلیل کو سمجھنے کے لئے پہلے چند اصولی باتیں ذہن نشین کر لیجئے!

[۱] مثلث (Triangle)، اس شکل کو کہا جاتا ہے جو تین خطوط کے باہم ملنے سے بنتی ہے۔ ان تین خطوط کو مثلث کے تین اضلاع (Sides) کہا جاتا ہے۔

[۲] اگر مثلث کے دو ضلعے اس طرح ملیں کہ ان کے ملنے سے زاویہ قائمہ (Right Angle) (۹۰ درجہ کا زاویہ) بن جائے تو ایسی مثلث کو مثلث قائم الزاویہ کہا جاتا ہے اور باہم ملنے والے ضلعوں میں سے نچلے ضلع کو قاعدہ (Base) اور اس پر گرنے والے ضلع کو عمود (Perpendicular) کہا جاتا ہے۔

اب آپ کو یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ مادہ کی حقیقت ابھی تک پوشیدہ اور مخفی ہے اور کوئی دماغ ابھی تک اس کی حقیقت تک یقینی طور پر نہیں پہنچ سکا؛ البتہ اپنے تجربہ اور خیال کے لحاظ سے جیسا کچھ کسی کو معلوم ہوا، اسی کے موافق اس نے تعبیر کر دی۔

---

[۳] ان دو ضلعوں کے علاوہ جو تیسرا ضلع ہے اسے وتر کہا جاتا ہے۔ (وتر، عمود، قاعدہ)

[۴] وہ نقطہ جس پر ضلعوں کا اتصال (Vertex) ہوتا ہے، دونوں میں مشترک شمار کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس شکل سے ظاہر ہے۔ (جزو مشترک)

اس میں ہر ضلع چار اجزا پر مشتمل ہے، مگر چوتھا جز دونوں میں مشترک ہے۔

[۵] وتر کی لمبائی دونوں ضلعوں کی مجموعی لمبائی سے کم اور ایک ضلع کی لمبائی سے زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی ہر ضلع اگر ایک انچ کا ہو تو دونوں ضلعوں کی مجموعی لمبائی دو انچ ہوگی اس صورت میں وتر کی لمبائی ایک انچ سے زیادہ اور دو انچ سے کم ہوگی۔

ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب آیئے حضرت معظمؒ کی بیان کردہ دلیل کی طرف اور داد دیجئے آپؒ کی ژرف نگاہی (Deep Insight) اور ریاضی میں مہارت تامہ کی:-

آپ کی دلیل کا ماحصل یہ ہے کہ اگر ہم ایک ایسی مثلث قائم الزاویہ فرض کریں جس کے دو ضلعوں (قاعدہ وعمود) میں سے ہر ضلع دو نا قابلِ تقسیم اجزاء پر مشتمل ہو تو اس صورت میں دونوں ضلعے مجموعی طور پر تین اجزاء پر مشتمل ہوں گے، کیونکہ جس جزو پر دونوں کا اتصال ہے وہ دونوں میں مشترک ہے جس طرح اس شکل سے واضح ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی مثلث کا وتر کتنے نا قابل تقسیم اجزاء پر مشتمل ہوگا، اگر کہا جائے کہ وتر دو اجزاء پر مشتمل ہوگا تو یہ اس لئے غلط ہے کہ اس صورت میں وتر ایک ضلع کے ساتھ مساوی ہو جائے گا حالانکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ وتر ایک ضلع سے بڑا ہوتا ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ وتر تین اجزاء پر مشتمل ہوگا تو یہ اس لئے غلط ہے کہ اس صورت میں وتر دونوں ضلعوں کی مجموعی لمبائی کے ساتھ مساوی ہو جائے گا۔ حالانکہ ثابت ہو چکا ہے کہ وتر دونوں ضلعوں کے مجموعہ سے کم ہوتا ہے۔ چنانچہ لازماً ماننا پڑے گا کہ وتر دو اجزاء سے زیادہ اور تین اجزاء سے کم ہوگا اور اس صورت میں ایک جز کی تقسیم لازماً تسلیم کرنا پڑے گی۔ [دائم]

اس مادے کی حالت ان فلاسفروں کے لحاظ سے بعینہٖ اس ہاتھی جیسی ہے جو اندھوں کے کسی گاؤں میں آ گیا تھا۔ اطلاع ملنے پر سب اندھے اس سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے اس کے پاس گئے۔ چونکہ ان کی بصارت تو تھی نہیں کہ آنکھوں سے دیکھ کر معلوم کرتے، اس لئے انہوں نے اس کو ہاتھوں سے چھو کر جاننا چاہا۔ کسی کے ہاتھ میں اس کے کان آئے اور کسی کے ہاتھ میں اس کی ران آئی۔ کسی کا ہاتھ اس کی پیٹھ پر پڑا اور کسی کے ہاتھ میں اس کی سونڈ آئی۔ جب سب لوٹ کر واپس آئے تو کسی نے ان سے پوچھا "کیا تم لوگ ہاتھی کے بارے میں اپنی تسلی واطمینان کر چکے ہو؟" تو انہوں نے کہا۔۔۔"ہاں جی، اچھی طرح "دیکھا" ہے۔" جب ان سے پوچھا گیا کہ اچھا بیان تو کیجئے کہ آپ نے کیا معلوم کیا ہے؟ تو پہلے نے کہا کہ چھاج جیسا تھا، دوسرے نے کہا کہ ستون جیسا تھا، تیسرے نے کہا کہ نہیں، وہ تو تخت جیسا تھا، چوتھے نے کہا کہ تم سب غلط کہہ رہے ہو، وہ تو دُرے (Whip) (کوڑے) کی طرح تھا۔ غرضیکہ جیسا کسی کے محدود تجربہ میں آیا، ویسا ہی اس نے یقین کر لیا۔

جب مادہ کی حقیقت یقینی طور پر متعین نہیں تو اس کے تمام اوصاف پر مطلع ہونے کا یقین کر لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ ذات کا درجہ صفات سے مقدم ہے اور ذات وصفات کے درمیان ایسا تعلق ہے کہ جب ذات کا علم من کل الوجوہ (ہر لحاظ سے) مکمل ہو جائے تو صفات کا علم بھی مکمل ہو جاتا ہے، ایسے ہی اس کے برعکس۔ جب عقل ذات کی حقیقت یقینی طور پر معین کرنے سے عاجز ہو تو صفات پر من کل الوجوہ علم کے یقین کا دعویٰ قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا؛ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی ذریعہ یا تجربہ وغیرہ سے ہم اس کی بعض صفات پر مطلع ہو جائیں۔ مثلاً ہم نے دیکھا کہ مادہ میں وزن ہوتا ہے، جگہ گھیرتا ہے اور جب کوئی مؤثر اس پر اثر کرے تو یہ متاثر ہو کر دوسری صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ہم کسی مادی چیز کو فنا کریں تو وہ بالکلیہ فنا ہو جائے، نہ

مادہ باقی رہے اور نہ صورت؛ بلکہ اجتماعی صورت زائل ہو جاتی ہے، اور مادہ باقی رہتا ہے جو دوسری صورت قبول کر لیتا ہے۔ لیکن ہمارا یہ تجربہ بالکل محدود ہے۔ ہماری عقل محدود، ہمارا زمانہ محدود، ہمارا مکان محدود، غرضیکہ ہم ہر جہت سے محدود ہیں اور قدرت من کل الوجوہ غیر محدود ہے۔ اس کے تعلقات غیر محدود، تاثیرات وتصرفات غیر محدود؛ بلکہ اول سے آخر تک تمام فلاسفہ کی عقول قدرت کے تصرفات اور اثرات کا ایک چھوٹا سا کرشمہ ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ غیر محدود شے اور اس کے احوال پر، محدود شے کسی طرح بھی محیط اور حاوی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا بعض نام نہاد فلسفیوں کا یہ دعویٰ کرنا کہ مادہ کے متعلق جو تحقیق ہماری عقلوں نے تجربہ کی بناء پر کی ہے، وہ یقینی اور دائمی ہے اور قدرت کے تمام تصرفات اس کے اندر محدود ہیں، کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

اور اگر ہم مان بھی لیں کہ ان کی یہ تحقیق صحیح ہے کہ مادہ فنا نہیں ہو سکتا تو بھی قیامت کے ثبوت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ قیامت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ عالم من کل الوجوہ ایسا فنا ہو جائے کہ اس کا نہ مادہ رہے اور نہ صورت، اور ایک نئے عالم کی بناء از سرِ نو ڈالی جائے؛ بلکہ یہ تو قیامت کے مقصد کے خلاف ہے، کیونکہ قیامت میں اسلامی عقیدے کے مطابق سب مردوں کو روح پھونکنے کے بعد قبروں سے اٹھا کر اللہ تعالیٰ کے روبرو حساب و کتاب کے لئے کھڑا کر دیا جائے گا، اور شریروں کی بداعمالیوں پر ان کے اعضاء گواہی دیں گے، اور ایسے ہی جس جس زمین کے حصے میں برے یا اچھے اعمال کریں گے وہی حصہ ان کے اعمال پر گواہ ہوگا۔ اگر یہ عالم بالکل فنا ہو جائے اور اس کا کوئی جزو، یعنی نہ مادہ رہے نہ صورت، تو ان اعضاء اور مقاماتِ زمین کی گواہی اور مردوں کا قبروں سے اٹھنا اور زمین کا دوسری صورت میں تبدیل ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس لئے کہ جب زمین اور اعضا کا نہ مادہ باقی رہے، نہ صورت، تو ان کی یہ شہادت کہ ہمارے اوپر اور ہمارے ساتھ اس شخص نے ایسے ایسے افعال کئے

ہیں، کیسے تصور کیا جاسکتا ہے؟

لہٰذا قیامت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ مادہ بالکل فنا ہو جائے؛ بلکہ اس مادے کا اس فانی اور عارضی نظام کے ختم ہو جانے کے بعد دوسرے باقی اور لا فانی نظام میں تبدیل ہونے کا نام عالمِ آخرت ہے۔

۳ سوال ۴۸

اگر آخرت بھی اسی طرح عالمِ مادی کا نام ہے تو آخرت میں بھی اس عالم کی طرح حیات وممات (Life & Death) کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ مادہ قابلِ تغیر شے ہے، ایک حال پر نہیں رہ سکتا، حالانکہ اسلام اس عالم میں سلسلۂ ممات (Death Process) کو نہیں مانتا؛ بلکہ وہاں حیاتِ دوام (Eternal Life) کو تسلیم کرتا ہے؟

۳ جواب ۴۸

{الف} مادہ میں تغیر تب پیدا ہوتا ہے جب کوئی مغیر و مؤثر اس کی موجودہ صورت کو زائل کرنے والا ہو، ورنہ فی نفسہٖ بغیر کسی مؤثر ومغیر کے مادہ میں تغیر نہیں ہوتا، چونکہ یہاں باعثِ تغیر وتبدیلی، حرکات فلکیہ (یعنی مختلف کروں کا اپنے اپنے مدار میں حرکت کرنا) اور اختلافِ اوضاع ارضیہ (یعنی زمین کے علاقائی یا موسمی حالات) ہیں اور یہ دونوں چیزیں وہاں نہیں ہوں گی اور نہ کوئی اور مؤثر مخالفِ وجود ہوگا لہٰذا وہاں تغیر وتبدل نہیں ہوگا۔ ہمیشہ ایک ہی رنگ اور ایک ہی حال رہے گا۔

{ب} اُس عالم میں اگرچہ یہی مادی وجود ہوگا؛ البتہ اِس عالم اور اُس عالم میں اتنا فرق ضرور ہے کہ اس عالم میں مادیت مطلقہ کو غلبہ ہے اور یہاں مادی احکام ہیں، اور اُس عالم میں روحانیت ونورانیت کو غلبہ ہوگا اور روحانی احکام ہوں گے۔ روح چونکہ تغیر وفنا قبول نہیں کرتی اس لئے وہاں تغیر وفنا نہ ہوگی۔ بخلاف یہاں کے کہ

یہاں غلبۂ مادیت کی وجہ سے مادی احکام ہیں، جن کے لحاظ سے تغیر وفنا ضروری ہے۔

سوال ۴۹

اس سے تو معلوم ہوا کہ روحانیات میں تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ حالانکہ قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ

﴿فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ﴾

[الزمر، آیة ۶۸]

{زمین اور آسمانوں والے سب (موت سے) بیہوش ہو جائیں گے سوائے ان کے جن کے متعلق خدائی مشیت نہیں ہے}

اس سے تو معلوم ہوا کہ جو چیزیں عالم سفلی سے مافوق اور روحانی ہیں، یعنی ملائکہ وغیرہ ان پر بھی موت آئے گی؟

جواب ۴۹

تغیر وتبدل نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ روحانیات کے تغیر سے عاجز ہے؛ بلکہ مطلب یہ ہے کہ فنا اور تغیر عادی اور سببی (Habitual and Causal) نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارادے کے آگے تو سب چیزیں عاجز و مسخر ہیں۔ یہ نہیں کہ جنت و دوزخ اور ان کی زندگی اللہ تعالیٰ کی قوت تصرف سے باہر ہے؛ بلکہ سب اس کے ارادہ وحکم کے تابع ہیں۔ چونکہ ان کے متعلق اس کا ارادہ بقا کا ہے، جیسا کہ اس نے اپنے مختار بندوں کے ذریعہ اپنے ارادہ کو ظاہر فرمایا ہے، لہٰذا یقین کیا جاتا ہے کہ ان پر فنا طاری نہیں ہوسکتی اور ملائکہ کے فنا ہونے کے بارے میں چونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، لہٰذا یقین کیا جاتا ہے کہ وہ چند لمحہ فنا ہوں گے؛ البتہ ان روحانیات کا تغیر وفنا ظاہری طور پر کسی ظاہری سبب وعلت پر موقوف نہیں۔ فقط اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی ان

میں مؤثر ہے۔ بخلاف اس عالمِ مادی کے کیونکہ اس میں ظاہری اسباب کی وجہ سے تغیر و فنا ہوتا ہے۔ اگر چہ درحقیقت ہر چیز میں مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

۵ سوال ۵۰

زمین کی گہرائی میں مردے بالکل مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائیں گے، تو پھر ان کی مٹی کا زمین سے جدا ہونا اور گوشت اور ہڈیاں وغیرہ بن جانا سمجھ میں نہیں آتا؟

دوسرے یہ کہ سب انسانوں کے اعضاء ایک جگہ اکٹھے تو نہیں ہوں گے؛ بلکہ بعض کے کچھ اجزاء ایک جگہ اور کچھ دوسری جگہ پڑے ہوں گے، تو ان میں روح پھونکنے کے لئے ان کو مٹی سے جدا کر کے کیسے جمع کیا جائے گا؟

۵ جواب ۵۰

اس کا سمجھنا نہایت آسان ہے، لیکن توجہ کی ضرورت ہے۔ بعض ملکوں میں جب چند سال قحط (Famine) پڑ جاتا ہے اور بارش بند ہو جاتی ہے تو تمام اطرافِ زمین پر غبار اٹھتا ہوا نظر آتا ہے اور سبزی و نباتات کا نام ونشان تک نہیں رہتا؛ بلکہ قحط کے بعد خشک شدہ زمین میں اگر کوئی تلاش کرنے والا نباتات کا بیج تلاش کرے تو اس کے ہاتھ میں سوائے خاک کے اور کچھ نہیں آتا؛ تاہم جب قادرِ مطلق اس زمین کو سرسبز کرنا چاہتا ہے تو ایسی رحمت آمیز بارش بھیجتا ہے کہ وہ مردہ نباتات جن کا نام ونشان کسی کو نہیں ملتا تھا، وہ باقی مٹی سے جدا ہو جاتی ہیں اور ان میں نباتاتی زندگی پڑ جاتی ہے اور زمین سرسبز وشاداب ہو جاتی ہے۔

مخلوقات کے فنا ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے چالیس سال تک زبردست بارش ہوگی جس کا پانی دور دور تک زمین کے اندر پہنچ جائے گا۔ یہ پانی جب انسان کے اجزاء اصلیہ سے ملا ہوا چند دن رہے گا تو ان اجزاء اصلیہ میں انقلاب رونما

ہو جائے گا، جو اجزاء گوشت بننے کے قابل ہیں، گوشت بن جائیں گے اور جو ہڈی بننے کے قابل ہیں وہ ہڈیاں بن جائیں گے۔ علی ھذا القیاس اس مٹی کے اجزاء اپنی اپنی مناسبت سے انسان کے اعضاء بن جائیں گے اور اس طرح انسان کا جسم تیار ہو جائے گا۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ کے حکم سے جیسے پہلے وہ ارواح اجسام میں پڑی تھیں ویسے ہی اسرافیل علیہ السلام کے صور (Trumpet) پھونکنے سے سابقہ مناسبت کی وجہ سے دوبارہ اپنے اپنے اجسام میں آجائیں گی اور انسان زندہ ہو جائے گا۔ ازاں بعد جیسے نباتات کے اگنے سے زمین؛ بلکہ پتھر پھٹ جاتے ہیں، ویسے ہی مردوں کی جگہ سے زمین پھٹ جائے گی اور مردے زندہ ہو کر باہر نکل آئیں گے۔

دوسرے اشکال (Ambiguity) کے حل کو اس طرح سمجھیں کہ جیسے غلے میں کچرا اور کنکر وغیرہ مخلوط ہوتے ہیں اور اس کو چھاج میں ڈال کر صاف کرنے کے لئے جھٹکتے اور ہلاتے ہیں تو کچرا وغیرہ الگ الگ ہو جاتا ہے اور صاف غلہ الگ جمع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو پہلے زمین کو بھی پھٹکا جائے گا اور زمین کو شدید حرکت آئے گی جس کی وجہ سے زمین کھوکھلی اور نرم ہو جائے گی اور پھر زمین کے عمق (گہرائی) سے انسانوں کے جتنے اجزاء اصلیہ ہوں گے، مٹی سے الگ ہو کر جمع ہو جائیں گے اور ان میں روح ڈال دی جائے گی۔

۶ سوال ۵۱

جب قبروں سے لوگ اٹھیں گے تو سب سے پہلے کون اٹھے گا؟

۶ جواب ۵۱

سب سے پہلے قبر سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہور فرما کر میدانِ قیامت

کو مزین فرمائیں گے، اس کے بعد اپنے اپنے مراتب کے مطابق باقی لوگ اٹھیں گے۔

سوال ۷ ۵۲

یہ لوگ جب قبروں سے اٹھیں گے تو ان کے جسموں پر کوئی لباس ہوگا یا بے لباس ہوں گے؟

جواب ۷ ۵۲

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے لباس میں اٹھیں گے اور باقی لوگ بے لباس ہوں گے۔ لیکن قیامت کا ہول اور خوف اس قدر ہوگا کہ تمام لوگ اپنے اپنے پسینے میں ڈوبے ہوں گے، کسی کو پردے یا بے پردگی کی طرف توجہ کرنے کا ہوش ہی نہیں ہوگا۔

سوال ۸ ۵۳

کیا اعمال کی کتابوں کا ملنا صحیح عقیدہ ہے؟ اگر صحیح ہے تو کس کیفیت سے ملیں گی؟

جواب ۸ ۵۳

یہ عقیدہ بالکل صحیح اور قرآن شریف سے واضح طور پر ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

﴿وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَاباً يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا٥﴾ [بنی اسرائیل، آیۃ ۱۳]

﴿اور نکالیں گے ہم اس کے لئے ایک کتاب جسے وہ کھلا ہوا پائے گا﴾

اعمال نامے ملنے کی یہ کیفیت ہوگی کہ نیک لوگوں کے اعمالنامے ان کے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے، جن میں ان کے اچھے اعمال کی کیفیت لکھی ہوگی جسے دیکھ کر وہ مطمئن و مسرور ہو جائیں گے۔ اور جو خدا کے نافرمان ہیں ان کے اعمالنامے ان کی پیٹھ کی طرف سے، ان کے بائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے، جن میں ان کے بُرے اعمال کی تشریح ہوگی اور وہ اسے دیکھتے ہی پریشان ہو جائیں گے۔

۹ سوال ۵۴

اعمال نامے کس چیز کے ہوں گے، کاغذ وغیرہ تو اس دنیا کی فانی چیزیں ہیں وہاں تو یہ موجود نہ ہوں گی؟

۹ جواب ۵۴

یہ تو صحیح ہے کہ یہ کاغذ وغیرہ وہاں نہیں ہوں گے لیکن اس عالم کے مناسب کوئی ایسی چیز ضرور ہوگی جس پر انسان کے تمام اعمال رقم ہوں گے اور انسان اس کو دیکھ کر مطلع ہو جائے گا؛ البتہ مکمل کیفیت کا علم اللہ علاّم الغیوب ہی کے پاس ہے۔

۱۰ سوال ۵۵

انسان کو جب اپنے بُرے اعمال کی سزا دی جائے گی تو اسے کیسے یقین ہوگا کہ اس کے ساتھ عدل وانصاف کیا گیا ہے؟ اگر وہ اپنے اعمال سے انکار کر دے تو اس پر اثبات کی کیا صورت ہوگی؟

۱۰ جواب ۵۵

اللہ تعالیٰ کے روبرو جب لوگ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے ان کے اعمال کے متعلق سوال کرے گا۔ اگر وہ انبیاء کی تبلیغ سے انکار کریں گے تو انبیاء سے پوچھا جائے گا، انبیاء کرام علیہم السلام اپنی تبلیغ کی ذمہ داری کو بطریق احسن پورا کرنے کا بیان فرمائیں گے اور ثبوت میں اس امت مسلمہ کو شہادت میں پیش کریں گے۔ یہ امت شہادت دے گی کہ ہمیں اپنے نبی ﷺ اور اپنی کتاب کے ذریعہ معلوم ہوا تھا کہ تمام انبیائے کرامؑ نے اپنے فریضۂ رسالت کو مکمل طور پر انجام دیا ہے اور تبلیغ احکام میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی ہے۔

اگر وہ بُرے اعمال سے انکار کریں گے تو ان کے اعضاء جن سے انہوں نے

وہ بُرے اعمال کیسے ہوں گے ان پر شہادت دیں گے کہ انہوں نے ایسے ایسے بُرے اعمال ہمارے ذریعہ کئے تھے اور زمین کے جس حصے پر وہ بُرے اعمال کیے گئے، وہ ان بُرے اعمال والوں کی گواہی دے گا کہ انہوں نے ایسے ایسے اعمالِ بد میرے اوپر کئے ہیں۔ ان شہادتوں کے بعد انسان تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

۱۱ سوال ۵۶

جن انسانوں کے اعمال اچھے اور بُرے مخلوط ہوں گے، انہیں کیسے معلوم ہوگا کہ ہمارے اعمال میں اچھے کتنے ہیں اور بُرے کتنے؟ اور اچھے زیادہ ہیں یا بُرے؟

۱۱ جواب ۵۶

اعمال کی کمی بیشی معلوم کرنے کے لئے میدان محشر میں ایک میزان ہوگی جس کے دو پلڑے ہوں گے۔ ایک پلڑے میں نیک اعمال رکھے جائیں گے اور دوسرے میں بُرے۔ ان دونوں پلڑوں میں سے جو پلڑا بھاری ہو کر جھک جائے گا، وہ اعمال دوسرے کی بہ نسبت بھاری ہوں گے۔ اس وزن سے انسان اپنے اعمال کے اندازے سے یقینی طور پر مطلع ہو جائے گا اور اس کو کوئی شبہ باقی نہیں رہے گا۔

۱۲ سوال ۵۷

اس میزان پر کس چیز کا وزن کیا جائے گا، نفسِ اعمال کا یا اعمال کی کتابوں کا؟ دونوں احتمال ناقابل قبول ہیں۔ پہلا اس لئے کہ اعمال صفات و اعراض (Attributes and Qualities) ہیں۔ ان کے لئے کوئی مستقل وجود نہیں اور وزن تو اس چیز کا ہو سکتا ہے جو ٹھوس ہو۔ اور دوسرا احتمال اس لئے کہ بعض اعمال تھوڑے ہوتے ہیں اور ان کا ثواب زیادہ ہوتا ہے اور بعض اعمال زیادہ ہوتے ہیں لیکن ان کا ثواب کم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے باوجود بھوکا ہونے کے اپنا کھانا کسی دوسرے مسکین کو دے

دیا اور خود بھوکا رہا، دوسرے نے اپنا پیٹ بھرنے کے بعد تین چار مساکین کو کھانا کھلا دیا۔ تو اس صورت میں پہلے شخص کا ایثار و صدقہ جتنا قابلِ تعریف اور قابلِ قدر ہے اتنا دوسرے کا نہیں۔ پہلے کو اس ایثار کا جو ثواب ملے گا دوسرے کو نہیں مل سکتا۔ حالانکہ اس صورت میں جیسا عمل پہلے شخص نے کیا ہے اس سے کہیں زیادہ دوسرے نے کیا ہے لیکن ثواب پہلے کو زیادہ ملے گا۔ ایسا ہی گناہوں کا حال ہے۔ ایک انسان نے کسی معمولی آدمی کو قتل کیا اور دوسرے نے کسی عظیم شخصیت، مثلاً نبی کو قتل کیا، تو ظاہری فعل میں تو دونوں مساوی ہیں لیکن آخرالذکر (دوسرے) کا جرم پہلے کی بہ نسبت بہت بڑا ہے اور وہ پہلے شخص کی نسبت زیادہ سزا و عذاب کا مستحق ہے۔ ایسی صورت میں اعمال کی مکمل جانچ پڑتال کیسے ہوسکتی ہے؟

۱۲ جواب ۵۷

دونوں احتمال قابل تسلیم ہیں لیکن عقل کی حدود کو قدرے وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلا احتمال تو اس لئے قابلِ انکار نہیں ہوسکتا کہ جس ذات نے اشیاء کو عدم سے نکال کر مستقل وجود عنایت کیا ہے، اس کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ غیر مستقل موجودات، یعنی اعراض و صفات کو بھی مستقل وجود عنایت کردے۔ ابھی تک ایسی کوئی عقلی دلیل قائم نہیں ہوسکی ہے جس سے اعراض کا وزن کرنا محال ثابت کیا گیا ہو۔ ہاں، یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمیں اس کا تجربہ نہیں۔ مگر ہمارا تجربہ نہ ہونا محال ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا، کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو واقعتہً موجود ہوتی ہیں لیکن ہمارے پاس ان کی واقعیت معلوم کرنے کے آلات و ذرائع نہیں ہوتے، اس لئے ہم ان کے معلوم کرنے سے عاجز و قاصر رہتے ہیں اور بہت سے کوتاہ عقل ان کے وجود سے

قطعی انکار؛ بلکہ ان کے محال ہونے کا یقین کر لیتے ہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ ان حکمتوں پر انسان کو مطلع کرنا چاہتا ہے تو ایسے آلات وذرائع اس کے دل پر الہام کر دیتا ہے جن کے ذریعے ان چیزوں کو بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ فلسفۂ قدیم وجدید سے واقف ہیں، ان پر یہ ظاہر ہے کہ بہت سے ایسے امور جن کو فلاسفۂ قدیم ارسطو وغیرہ نے آلات وذرائع نہ ہونے کی وجہ سے اپنی عقل مغلوب الوہم کی وجہ سے محال ثابت کیا تھا، تحقیقات جدیدہ نے آلات واسباب کے ذریعے ان کا وجود بالمشاہدہ ثابت کر دیا ہے۔ ویسے ہی بہت ممکن ہے کہ اعراض وصفات کا کوئی لطیف وجود فی نفسہٖ جواہر و اجسام سے الگ ہو لیکن ہمارے حواس وعقول چونکہ کثافتوں میں محجوب ہیں، اس لئے لطیف وجود معلوم کرنے سے قاصر ہیں۔ ہماری تمام قوت وتجربہ چونکہ کثیف اجسام تک محدود ہے، لہٰذا جب تک وہ اعراض کسی کثیف جسم سے متعلق نہ ہوں، ہم معلوم نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر ان حجابات اور کثافتوں کو ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ دور کر دیا جائے اور دل کے آئینہ کو صاف وصیقل کر لیا جائے تو صفات واعراض کا وجود مستقل بغیر اجسام کے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ جیسے کہ اولیاء میں سے خاتم الولایۃ شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ ① نے تمام صفات واعمال کا وجود ثابت کیا ہے اور ان کے وجود کے متعلق اپنا

---

①← (۵۶۰ھ/۱۱۶۵ء---۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) ابوبکر محمد بن علی محی الدین الاندلسی بہت بڑے دانشور، محقق، فلسفی اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مرسیہ (اندلس) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۳۰ سال تک اشبیلیہ میں قیام کیا۔ پھر مشرق کا رخ کیا اور متعدد ممالک کا سفر کرتے ہوئے دمشق پہنچے۔ نظریہ وحدت الوجود کے اوّلیں شارح وداعی تھے، جنہوں نے نہایت بسط وتفصیل سے اس نظریہ کی تشریح و توضیح کی اور اس کے لئے مضبوط دلائل فراہم کئے۔ بعض علماء ظاہر نے ان کے اس نظریئے کو الحاد ☜

مکمل اور صحیح مشاہدہ بیان فرمایا ہے۔

حکماء اور فلاسفہ قدیم میں سے افلاطون جو نہایت محقق و سرگروہ فلاسفہ اور مظہر روحانیات تسلیم کیا جاتا ہے، وہ بھی اس تمام عالم کے صفات و اعراض، مثلاً حرکت، سکون، زمان، خط، سطح اور نقطے کا وجود مستقل بغیر جسم کے تسلیم کرتا ہے، لیکن اس عالم میں نہیں؛ بلکہ ایک دوسرے عالم میں جس کو عالمِ مثال کہا جاتا ہے۔

فیثا غورث (Pythagoras) جو افلاطون (Plato) سے پہلے نہایت لائق فلسفی اور ماہر روحانیات گذرا ہے۔ اس نے یہاں تک مبالغہ کیا ہے کہ وہ اس تمام عالم کی اصل ہی ان صفات کو تسلیم کرتا ہے۔

نظام معتزلی جو مسلمانوں میں قدیم عقل پرست جماعت کا مقتدا ہے، تمام عالم کا وجود اعراض سے مانتا ہے اور کہتا ہے کہ اعراض کا وجود بسیط ہے اور ان بسائط کی ترکیب واجتماع سے اجسام بنے ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ بڑے بڑے محقق، حکماء، فلاسفہ اور دوسرے عقلاء نے اعراض وصفات کے لئے حقائق واقعیہ تسلیم کئے ہیں اور اولیاء اللہ اپنے کشف اور صفائے قلب سے ان حقائق کا مشاہدہ ثابت کر چکے ہیں۔ لہٰذا اس میں کوئی استحالہ (ناممکن بات) نہیں کہ اعمال کا مستقل وجود اور حقائق واقعیہ ہوں اور

وزندقہ (Apostasy & Unbelief) سے تعبیر کیا ہے۔ مگر صوفیاء انہیں الشیخ الاکبر کہتے ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد تین سو کے قریب ہے جن میں فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم بہت مشہور ہیں اور کتب تصوّف میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ ابن عربی شاعر بھی تھے۔ ان کی عارفانہ نظموں کا مجموعہ ''ترجمان الاشواق'' کے نام سے شائع ہوا تھا، جس کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر نکلسن نے کیا۔

ان کا وزن قیامت کے دن کسی مناسب طریقے سے ہو جائے۔ یہ ضرور ہے کہ قیامت کا میزان یہاں کے لوہے اور لکڑی وغیرہ کا ترازو نہیں ہوگا اور نہ وہاں یہاں جیسے باٹ ہوں گے؛ بلکہ اعمال کے مناسب کوئی ایسی چیز ہوگی جس کے ذریعہ سے اعمال کی کمی بیشی کا اندازہ ہو سکے گا اور ہر شخص کو اس کے اعمال کی مقدار صحیح طور پر معلوم ہو جائے گی۔

دوسرا احتمال کتبِ اعمال کے وزن سے تعلق رکھتا ہے، تو یہ اس طور پر قابل تسلیم ہے کہ جیسے اعمال ہوں، ویسے ہی ان کے ساتھ وجوہ ترجیح کی مکمل تشریح بھی ہو۔ جو عمل کم درجے کا ہو، اس کی وجوہ ترجیح بھی کم ہوں اور جو عمل زیادہ درجے کا ہو، اس کی وجوہ ترجیح بھی زائد تحریر ہوں۔ اس طرح جس کے اعمال کیفیت (Quality) کے لحاظ سے زائد ہوں گے، اس کا نامۂ اعمال بھی وزن میں زائد ہوگا اور جس کے اعمال کیفیت کے اعتبار سے کم ہوں گے، اس کا نامۂ اعمال بھی کم وزن ہوگا۔ واللہ اعلم.

۱۳ سوال ۵۸

کیا ایسے موقعہ پر اللہ تعالیٰ بندوں کے گناہ معاف بھی فرمائے گا؟

۱۳ جواب ۵۸

جن لوگوں نے شرک وکفر نہیں کیا، ان کے گناہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو معاف فرما دے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰالِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ط﴾

[النسآء، آیة ۴۸ اور ۱۱۶]

﴿اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے، اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے گا معاف کر دے گا۔﴾

قیامت کو اللہ تعالیٰ مہربانی اور رحمت دنیا کے مقابلے میں بہت زیادہ کرے

گا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصوں میں سے ایک حصہ دنیا میں تقسیم کیا ہے اور باقی سب آخرت کے لئے محفوظ ہیں۔

۱۴ سوال ۵۹

کیا ایسے سخت موقعہ پر کوئی سفارش بھی کر سکے گا اور کیا کسی کی شفاعت سے کسی کو فائدہ بھی ہوگا؟

۱۴ جواب ۵۹

ہاں، بے شک۔ اللہ تعالیٰ کے اذن سے شفاعت ہوگی اور جن کے حق میں شفاعت ہوگی ان کو فائدہ بھی ہوگا۔ شفاعت کرنے والا جتنا اللہ تعالیٰ کا زیادہ مقرب ہوگا اتنا اس کی شفاعت سے مخلوق کو زیادہ فائدہ ہوگا۔ اسی طرح درجہ بدرجہ اللہ تعالیٰ کے مقرب انبیاء اور اولیاء شفاعت کریں گے، جس کی وجہ سے بے گناہوں کے مرتبے بڑھیں گے اور جو گنہگار ہوں گے ان کے گناہوں کی معافی ہوگی۔ لیکن یہ شفاعت انہی لوگوں کے حق میں ہوگی، جن کے عقائد درست ہوں اور ایمان صحیح ہو۔ جن لوگوں کے عقائد درست نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ بندوں، یعنی ابنیاء و ملائکہ اور احکام الٰہیہ کے متعلق نامناسب اور غلط عقیدہ رکھتے ہوں اور ان کو تسلیم نہ کرتے ہوں، ان کے حق میں نہ کوئی شفاعت کرے گا اور نہ ہی شفاعت قبول ہوگی۔

۱۵ سوال ۶۰

جن کے حق میں شفاعت کی جائے گی، وہ لوگ جنت کے قابل ہوں گے یا دوزخ کے؟ اگر جنت کے قابل ہوں گے تو ان کو جنت میں جانا ضروری ہے کیونکہ جو کوئی جس چیز کے قابل ہوتا ہے، وہی اس کو دی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ ظلم ہوگا اور اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے۔ پس ایسی صورت میں شفاعت کی کیا ضرورت

ہے؟ اور اگر وہ لوگ قابلِ دوزخ ہیں تو ان کو دوزخ ملنا چاہئے۔ اس لئے کہ ہر شئے کو اپنے محل میں اور جس کے قابل وہ ہے اسی میں رکھنا عدل ہے۔ لہٰذا جو لوگ قابل دوزخ ہیں ان کو دوزخ سے بچانے کے لئے شفاعت کرنا، نہ تو مناسب ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو ایسی شفاعت کی سماعت چاہئے؟

۱۵ جواب ۶۰

جب تک وہ لوگ معصیت اور جرم سے ملوث تھے، قابل عذابِ دوزخ تھے، اور جب انبیاء کرامؑ کی شفاعت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو پاک کر دیا، تو وہ جنت کے قابل ہو گئے۔ وجوہ کے اختلاف سے احکام و احوال مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ جب کپڑے میں میل ہوتا ہے، تو اس کو پہننے کے قابل نہیں سمجھا جاتا اور جب دھوبی اس کے میل کو دور کر کے پاک صاف کر دیتا ہے تو سبھی اسے شوق سے زیب تن کرنا پسند کرتے ہیں۔ ایسے ہی یہاں سمجھ لیجئے۔ جب تک وہ لوگ گناہ کے میل اور ظلمت سے پاک نہیں ہوئے تھے، قابل جنت نہ تھے؛ بلکہ قابلِ دوزخ تھے، جو میلے اور سیاہ کار لوگوں کی جگہ ہے، مگر جب نیک بندوں کی شفاعت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پاک صاف ہو گئے تو وہ قابلِ جنت ہو گئے۔

۱۶ سوال ۶۱

سب سے پہلے شفاعت کون کرے گا؟

۱۶ جواب ۶۱

سب سے پہلے ایسے موقعہ پر شفاعت کے لئے دربارِ الٰہی میں وہی جائے گا جو اللہ تعالیٰ کا زیادہ مقرب ہو گا اور ہم بحثِ نبوت میں ثابت کر چکے ہیں کہ مخلوقات میں سب سے زیادہ مقرب و افضل اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لہٰذا سب سے

پہلے آپ ہی شفاعت فرمائیں گے، اس کے بعد باقی انبیاء، علی نبینا وعلیھم الصلوٰۃ والسلام اور اولیاء کرام اور صالحین شفاعت فرمائیں گے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ پریشانی کے ایسے موقعہ پر حضرت آدم علیہ السلام کو ابوالبشر خیال کرتے ہوئے لوگ ان کے پاس شفاعت کے لئے جائیں گے، تو وہ اپنے جنت سے نکلنے کے سبب کو ذکر فرماتے ہوئے انکار کریں گے اور نوح علیہ السلام [1] کا حوالہ دیں گے، وہ اپنے طوفان کا، جو ان کی بددعا سے آیا تھا اور جس میں تمام مخلوق غرق ہوگئی تھی، ذکر فرماتے ہوئے معذوری ظاہر فرمائیں گے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا

---

[1] ← نوح علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ زمانہ اور وطن معلوم نہیں۔ انجیل کی کتاب پیدائش میں آپ کی عمر ۹۵۰ سال درج ہے مگر قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ طوفان نوح کے وقت نوح علیہ السلام کی عمر ۹۵۰ سال تھی۔ ابوالحاتم سجستانی اپنی کتاب ''المعمرین'' میں آپ کی عمر ۱۴۵۰ برس بیان کرتا ہے۔ نوح علیہ السلام کے باقی رہنے والے تین بیٹے تھے، سام، حام اور یافث۔ چوتھا بیٹا کنعان تھا، جو ایمان نہ لایا اور طوفان میں ہلاک ہوا۔ جب نوح علیہ السلام کی قوم نے اللہ اور اس کے پیغمبر نوح علیہ السلام پر ایمان لانے سے انکار کر دیا تو نوح علیہ السلام نے اللہ سے درخواست کی کہ منکروں کو سزا دی جائے۔ اللہ نے نوح علیہ السلام کی التجا قبول کر لی اور سرکش قوم کو طوفان میں برباد کرنے کا فیصلہ کیا، نیز نوح علیہ السلام کو ہدایت کی کہ وہ ایک کشتی بنائیں اور جب طوفان آئے تو اپنے پیروکاروں سمیت کشتی میں بیٹھ جائیں، اور جانوروں کا ایک ایک جوڑا بھی ساتھ رکھ لیں۔ تب ایک زبردست طوفان آیا اور سیلاب کے باعث ساری دنیا غرق ہوگئی۔ مگر نوح علیہ السلام کی کشتی کو کوئی ضرر نہ پہنچا۔ طوفان سات روز کے بعد تھم گیا اور کشتی کوہ جودی پر جا لگی۔ زمین کے خشک ہونے پر حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد روئے زمین پر پھیل گئی۔ سام سے سامی نسل کے لوگ پیدا ہوئے، یعنی یورپی اقوام حام سے اور یافث سے ایشیائی لوگ۔ ؏

حوالہ دیں گے، وہ قبطی کے قتل ① کے واقعہ کو یاد فرما کر معذرت کا اظہار فرمائیں گے اور حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کے پاس جانے کا مشورہ دیں گے، لوگ ان کے پاس جائیں گے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو کہ

﴿ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللهِ﴾

[المائدہ، آیۃ، ۱۱٦]

﴿کیا تم نے لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ اللہ کے علاوہ مجھے اور میری والدہ کو خدا مانو﴾

یاد کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے کہیں گے کہ اس موقعہ پر کہیں پھر یہ سوال نہ ہو جائے۔ اس بنا پر وہ لوگوں سے کہیں گے کہ تم خاتم النبین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ کہ آپ ہی اس درد کی دوا کر سکتے ہیں۔ جب سب سے مایوس ہو کر لوگ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں مضطرب الحال آئیں گے، تو ان کی عاجزی کو قبول فرماتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دربار الٰہی میں حاضر ہو کر عرش کے نیچے سجدے میں گر جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا

﴿اِرْفَعْ رَاْسَکَ یَا مُحَمَّدُ! سَلْ تُعْطَ﴾ [صحیح مسلم، کتاب الایمان]

﴿اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سر اٹھایئے، جو کچھ آپ مانگیں گے دیا جائے گا۔﴾

اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سر مبارک اٹھا کر سب امتوں سے پریشانی دور کرنے کا سوال کریں گے، جو اللہ تعالیٰ منظور فرما لے گا۔ اس کے بعد دوسرے انبیائے کرامؑ بھی دربار خداوندی میں حاضر ہو کر اپنی امتوں کے لئے خاص طور پر شفاعت فرمائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی مغفرت اور رفع مراتب کا سوال پیش فرمائیں گے اور

---

① ← قبطی قوم کا ایک ظالم شخص ایک اسرائیلی کو مار رہا تھا۔ اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر فریاد کی اور دہائی دی۔ موسیٰ علیہ السلام غصے میں آ گئے اور قبطی کو ایسا مکا مارا کہ وہ مر گیا۔

اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمالے گا۔

سوال ۱۷ ۶۲

کیا شفاعت صرف مؤمنوں کے لئے ہوگی یا کافروں کے لئے بھی ہو سکے گی؟

جواب ۱۷ ۶۲

شفاعت صرف مؤمنوں کے حق میں ہوگی۔ اس لئے کہ شفاعت جس کے لئے کی جاتی ہے، اس کی نجات کے لئے کوئی ایسی وجہ بیان کی جاتی ہے، جس سے حاکم خوش ہو جائے اور اس کا غیض وغضب ٹھنڈا ہو جائے۔ کفار اپنے عقیدے کے لحاظ سے بھی مستحق عتابِ الٰہی ہیں اور جسمانی اعمال کے حوالے سے بھی قابلِ عذاب ہیں، لہٰذا ان میں سے کوئی وجہ اس قابل نہیں جس کو دربارِ الٰہی میں پیش کر کے ان کی معافی کی درخواست پیش کی جائے؛ جبکہ وہ لوگ جن کے قلوب برے عقائد سے سیاہ نہیں ہوئے اور پاکیزہ عقیدوں کی وجہ سے ان کے دل روشن ہیں، تو گو ان کے اعمال اچھے نہیں ہیں، لیکن ان کے دل اس قابل ہیں کہ ان کے سبب سے اللہ تعالیٰ خوش ہو اور ان کے دلوں کی حالت کو دربارِ الٰہی میں پیش کر کے معافی چاہی جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کی ترکیب دو چیزوں سے ہے، ایک روح، دوسری جسم، روح اصل ہے اور جسم فرع۔ اصل اگر ضائع اور بیکار نہ ہو تو فرع گو کچھ خراب بھی ہو، اس کی اصلاح ہو سکتی ہے اور اگر کسی چیز کی اصل ہی تباہ و بے کار ہو جائے تو پھر اس کی اصلاح ناممکن ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر درخت کو خیال فرمایئے، اگر اس کی جڑ صحیح وسالم ہو تو اس کی شاخیں کسی وجہ سے خراب بھی ہو جائیں تو یہ خرابی عارضی سمجھی جاتی ہے اور اس کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن جب کسی درخت کے متعلق یقین ہو جائے کہ اس کی اصل جڑ بیکار ہو گئی ہے تو اس کی اصلاح سے

مایوس ہو کر اس کے لئے کوئی تدبیر نہیں کی جاتی۔ یہی مثال مؤمن اور کافر کی ہے۔ کافر کی اصل، یعنی روح، عقائد ظلمانیہ اور خیالاتِ باطلہ کے سبب ایسی غلیظ اور سیاہ ہو جاتی ہے کہ اس میں اس چیز کی قابلیت ہی باقی نہیں رہتی کہ کسی تدبیر سے اس کی ظلمت اور غلاظت کو دور کر کے اس کو ظلمانی مقام، جہنم سے نکالا جا سکے اور اس نورانی مقام، جنت میں داخل کیا جائے جو پاک اور نورانی لوگوں کی جگہ ہے۔ لہٰذا کفار کے لئے سوائے جہنم کے کوئی دوسرا مقام موزوں نہیں ہو سکتا اور نہ ان کے لئے تدبیر شفاعت ہو سکتی ہے۔ اس لئے ان کے لئے کوئی شفاعت نہیں کر سکتا۔

۱۸ سوال ۶۳

پل صراط کیا چیز ہے اور وہ کہاں ہے؟

۱۸ جواب ۶۳

میدانِ حساب اور جنت کے درمیان جہنم ہوگا، جس پر پل صراط ہوگا۔ جو لوگ حساب کے بعد جنت میں جائیں گے، انہیں اس پل صراط سے گزرنا ہوگا۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ [مریم، آیة ۷۱]

﴿اور تم میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو جہنم پر سے ہو کر نہ گزرے۔ یہ ایک فیصل شدہ وعدہ ہے جس کا پورا کرنا تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔﴾

حدیث شریف میں آیا ہے کہ یہ پل بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہوگا۔ لیکن اس کی یہ تیزی اور باریکی ان لوگوں کے لئے مضر ہوگی، جن کے ایمان ضعیف ہوں گے۔ یعنی اس پر گذرنے کی رفتار ایمانی قوت پر منحصر ہے۔ جیسی کسی کی ایمانی قوت ہوگی، ویسی ہی اس کی رفتار بھی ہوگی۔ اگر ایمانی قوت بڑھی ہوئی اور زیادہ ہے،

تو رفتار بھی بڑھی ہوئی اور تیز ہوگی۔ اور اگر ایمانی قوت ضعیف اور کمزور ہے، تو رفتار بھی کمزور ہوگی۔ چنانچہ بعض کی رفتار بجلی کی طرح ہوگی اور بعض کی تیز گھوڑے کی طرح، بعض کی اس سے کم اور بعض کی اس سے بھی کم ہوگی۔ جن کی ایمانی حالت قدرے اچھی ہوگی وہ ضرور کسی نہ کسی طرح گزر جائیں گے اور جو ایمانی قوت سے خالی ہوں گے وہ نیچے جہنم میں گر جائیں گے۔

گویا پل صراط کو خدائی شریعت کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ جو لوگ یہاں (دنیا میں) خدائی راستے پر چلنے میں کوتاہی نہیں کرتے، وہ وہاں (آخرت میں) بھی اس پل سے بے خوف وخطر گزر جائیں گے اور جن کو یہاں شریعت کے راستے پر چلنا مشکل نظر آتا ہے، ان کے لئے وہاں اس پل پر سے گزرنا بھی دشوار ہوگا۔ جو اِس شریعت کے راستے سے گر کر گمراہی میں جا پڑیں، وہ اُس راستے میں بھی گر کر دوزخ میں، جو گمراہی کا نتیجہ ہے، جا پڑیں گے۔

۱۹ سوال ۶۴

کیا جنت اور دوزخ تیار ہو چکے ہیں، یا آئندہ بروز قیامت تیار ہوں گے؟

۱۹ جواب ۶۴

دونوں تیار ہو چکے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں جنت کے متعلق فرمایا

﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ [آل عمران، آیۃ ۱۳۳]

{پرہیز گاروں کے لئے تیار کی جا چکی ہے}

﴿أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِينَ﴾ [البقرۃ، آیۃ ۲۴]

{کافروں کے لئے تیار کی جا چکی ہے}

ان دونوں آیتوں سے واضح ہے کہ جنت اور دوزخ دونوں تیار ہو چکی ہیں۔
ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات اور احادیث ایسی ہیں جن سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ دونوں تیار کی جا چکی ہیں۔

۲۰ سوال ۶۵

جنت یا دوزخ میں تو لوگ قیامت کے بعد جائیں گے، پھر قیامت سے قبل ان کے تیار کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

۲۰ جواب ۶۵

قیامت دو قسم کی ہے۔ ایک قیامت صغریٰ اور دوسری قیامت کبریٰ۔ کبریٰ تو دوبارہ پیدا ہونے کا نام ہے اور وہ عام ہے، سارے عالم کے لئے ہوگی۔ اور قیامت صغریٰ ہر شخص کے لئے علٰیحدہ علٰیحدہ ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص مر جاتا ہے، تو اس کی قیامت قائم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے۔

﴿مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ﴾

[جو کوئی مر جاتا ہے، تو اس کی قیامت قائم ہو جاتی ہے]

یہ قیامت صغریٰ، قیامت کبریٰ کی تمہید اور مقدمہ کی طرح ہے۔ اس میں گو قیامت کبریٰ کی طرح جنت و دوزخ میں داخل ہونا نہیں ہوتا، لیکن جنت و دوزخ کا قرب ضرور ہوتا ہے۔ برے لوگ برزخ کے طبقۂ سِجّین میں، جو دوزخ کے متصل ہے، رہیں گے۔ اور دوزخ کے اثرات سے متاثر اور پریشان ہوتے رہیں گے۔ صبح و شام حجاب اٹھا کر ان کو بغرض ندامت وحسرت دوزخ دکھایا بھی جائے گا، کہ تمہارے سیاہ اور برے اعمال کا یہی نتیجہ اور انجام ہے، تم اسی کے مستحق ہو، اسی میں تمہیں آئندہ رہنا ہوگا۔ اسی طرح جنت کا حجاب بھی دور کیا جائے گا اور انہیں دکھا کر بتایا جائے گا کہ

اگر تمہارے اعمال سیاہ اور برے نہ ہوتے؛ بلکہ پاک صاف ہوتے تو تمہیں یہ پاک اور مقدس مقام ملتا۔

اسی طرح صالح اور نیکوکار لوگوں کو بھی مرنے کے بعد دوزخ دکھایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اگر تم سیہ کار اور بدعمل ہوتے تو تمہیں اس کا نتیجہ یہ ملتا۔ اس کے بعد جنت کا حجاب اٹھا کر انہیں دکھایا جائے گا اور انہیں کہا جائے گا کہ تمہارے اچھے اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ مقام عطا فرمایا ہے، لہٰذا اس کا شکر ادا کرو۔

نیک اور صالح لوگ برزخ کے اعلیٰ حصے میں، جسے عِلِّيِّيْن کہا جاتا ہے، رہیں گے۔ یہ حصہ چونکہ جنت کے پڑوس میں ہے، اس لئے اگرچہ یہ لوگ جنت میں داخل نہیں ہوں گے، لیکن جنت کے پاکیزہ آثار سے ضرور محظوظ ہوں گے اور صبح وشام ان کو جنت کے مناظر دکھائے جائیں گے۔ نیز بعض پاکیزہ ہستیوں کو کبھی کبھی جنت میں جانے کا موقعہ بھی ملتا رہے گا۔ جیسے کہ حدیث شریف میں شہداء کی ارواح کے متعلق وارد ہے۔

اس بیان سے بخوبی معلوم ہو گیا ہے کہ جنت اور دوزخ کا پہلے تیار کرنا عبث (بے فائدہ) نہیں ہے؛ بلکہ اس میں بہت سے فوائد مضمر ہیں۔

۲۱ سوال ۶۶

اس جواب سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ قیامت سے پہلے قبر میں بھی عذاب و ثواب ہوگا؟ اگر ایسا ہے تو اس کے کیا دلائل ہیں؟

۲۱ جواب ۶۶

اس کے متعدد دلائل ہیں۔ ہم یہاں صرف دو دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ایک نقلی، دوسری عقلی۔ نقلی دلیل تو وہ آیت مبارکہ ہے جو آلِ فرعون کے عذاب کے متعلق ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

﴿وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوْءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ قف اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝﴾ [مؤمن، آية ۴۵، ۴۶]

﴿اور آل فرعون کو برے عذاب نے آ گھیرا۔ اس آگ نے جس کے سامنے وہ صبح شام پیش کئے جاتے ہیں۔ اور جس روز قیامت برپا ہوگی (تو حکم ہوگا کہ) آلِ فرعون کو سخت عذاب میں داخل کردو۔﴾

ظاہر ہے کہ اس آیت کریمہ میں آل فرعون کو صبح و شام آگ پر پیش کرنے کا جو ذکر ہے، وہ قیام قیامت سے پہلے کا ہے۔ کیونکہ عذاب قیامت کا ذکر ''وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ'' الآیۃ سے مستقل طور پر بعد میں کیا گیا ہے۔ اور قیامت سے پہلے زمانہ قبر ہی کا ہے، اس لئے لازماً قبر میں عذاب وثواب ہوگا۔

اور عقلی دلیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر اس کو طویل عرصے تک اچھے برے اعمال کی جزا و سزا سے محروم رکھنا عدل و انصاف اور حکمت کے خلاف ہے۔ عمل ختم ہونے کے ساتھ ہی کسی نہ کسی شکل میں اس کو عمل کا بدلہ ملنا چاہئے۔ اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب عذاب وثواب قبر کو تسلیم کیا جائے۔

۲۲ سوال ۶۷

اگر عذاب وثواب قبر میں ہی مل جائے تو پھر قیامت کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ حالانکہ اہل اسلام یوم قیامت کو ہی روز جزا تسلیم کرتے ہیں؟

۲۲ جواب ۶۷

قبر کا عذاب وثواب کامل نہیں ہے۔ یہ صرف آنے والے عذاب وثواب کی علامت ہے۔ اس لئے کامل عذاب وثواب کے لئے کسی دوسرے دن کا ماننا لازمی ہے

اور وہی دن یوم قیامت ہے۔

سوال ۲۳ / ۶۸

قبر کا عذاب وثواب انہی لوگوں کو مل سکتا ہے جو قبر میں دفن کئے جائیں، لیکن جو لوگ دریا میں بہ جائیں یا ان کو درندے چیر پھاڑ کر کھالیں، ان کو تو قبر کا عذاب و ثواب نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ تو قبر میں دفن ہی نہیں ہوئے۔

جواب ۲۳ / ۶۸

یہاں قبر سے مراد کھودا ہوا گڑھا نہیں ہے؛ بلکہ وہ سارا زمانہ ہے جو مرنے کے وقت سے لے کر قیامت تک ہے، خواہ یہ زمانہ کسی بھی حالت میں گزرے۔ لیکن چونکہ اکثر مردے قبر ہی میں دفن ہوتے ہیں، اس لئے اس زمانے کی تعبیر قبر سے کر دیتے ہیں۔

سوال ۲۴ / ۶۹

قبر میں تو مردہ بالکل مٹی ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی زندگی اس میں باقی نہیں رہتی۔ اس صورت میں عذاب وثواب کس طرح ہوسکتا ہے؟ خصوصاً احادیث میں جو ذکر ہے کہ بدعمل مردے کو سانپ اور بچھو کاٹتے ہیں اور اس کے لئے جہنم کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے، جس میں سے جہنم کی حرارت، تعفن اور گرم ہوائیں گزر کر اس تک پہنچتی رہتی ہیں اور نیک عمل مردہ مزے اور آرام میں ہوتا ہے اور اس کے لئے جنت کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے، جس میں سے فرحت، خوشبو اور ٹھنڈی ہوائیں گزر کر اس تک پہنچتی رہتی ہیں۔ حالانکہ بارہا قبریں کھودی جاتی ہیں تو نہ تو ان میں سے کبھی سانپ نکلے، نہ بچھو اور نہ ہی کبھی جنت یا جہنم کی طرف کھلی ہوئی کھڑکی نظر آئی؟ نیز سانپ اور بچھو کے کاٹنے کی تکلیف اور اسی طرح ٹھنڈی ہواؤں کی فرحت اور سرور مردے کو تب ہی

حاصل ہو سکتے ہیں، جب وہ قبر میں مع روح کے موجود ہو۔ حالانکہ وہاں مٹی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا؟

۲۴ جواب ۶۹

قبر کے عذاب وثواب میں علماء اسلام کی دو آراء ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ عذاب وثواب روحانی ہوتا ہے۔ یعنی مردے کی روح کو عالم برزخ میں عذاب وثواب ہوتا ہے۔ اس صورت میں سانپ، بچھو اور کھڑکیاں وغیرہ سب برزخی نوعیت کی ہوں گی اور برزخی چیزیں ہم کو نظر نہیں آسکتیں۔

نیز اس صورت میں عذاب وثواب صرف روح کو ہوگا، اس لئے اگر جسم مٹی بھی ہو جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

دوسری رائے یہ ہے کہ عذاب وثواب روح اور جسم دونوں کو ہوتا ہے اور یہی رائے فقیر کو بھی پسند ہے، کیونکہ حدیث شریف میں

﴿ تُعَادُ رُوْحُهٗ فِیْ جَسَدِهٖ ﴾ [ابو داؤد، کتاب السنة، مُسند احمد، باب مُسند الکوفیین]

[مردے کی روح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے]

وارد ہے۔ رہا یہ سوال کہ قبر میں جسم باقی نہیں رہتا تو جسم کو عذاب وثواب کس طرح ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جسم گوشت پوست اور ہڈیوں کے مرکب کی صورت میں اگرچہ باقی نہیں رہتا، لیکن مٹی کی صورت میں تو باقی رہتا ہے۔ یعنی جسم کے جو اجزا مٹی بن جاتے ہیں وہ تو موجود ہوتے ہیں۔ اور عذاب وثواب کا احساس جسم کے ان اجزاء کو ہوتا ہے جو مٹی کی شکل میں موجود ہیں۔

اور یہ سوال کہ سانپ، بچھو اور کھڑکیاں وغیرہ نظر نہیں آتیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کے نظر نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز سرے سے موجود ہی نہ

ہو۔ کائنات کی بے شمار حقیقتیں ایسی ہیں جن تک تا حال علم انسانی کی رسائی نہیں ہو سکی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کائنات میں مخفی حقیقت ہی کوئی نہیں؛ بلکہ بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جو انسانی دسترس میں ہیں، اس کے باوجود مخصوص آلات کے بغیر نظر نہیں آتیں۔ مثلاً جراثیم کو لے لیجئے، کہ مخصوص آلات کے بغیر نظر نہیں آسکتے، لیکن اگر کسی کو نظر نہ آئیں تو وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہے کہ جراثیم کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

بعینہ یہی بات یہاں پر ہے کہ مردے کی روح چونکہ قید جسم سے آزاد ہوتی ہے اور اس کے ساتھ کسی قسم کی کثافت نہیں ہوتی، اس وجہ سے مرنے کے بعد اسے وہ چیزیں بھی نظر آجاتی ہیں جنہیں دیکھنے سے وہ روح قاصر ہوتی ہے جو جسم میں مقید ہو اور مادی کثافتوں سے آلودہ ہو۔ اس بناء پر مردے کو سانپ اور بچھو وغیرہ نظر آتے ہیں، لیکن زندہ لوگوں کو نظر نہیں آسکتے۔ مگر وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ حقائق موجود ہی نہیں ہیں؛ جبکہ ان حقائق کہ خبر خدا اور رسول نے دی ہے، جو ان حقائق کا علم رکھتے ہیں۔

۲۵ سوال ۷۰

یہ کہنا کہ ''عذاب وثواب کا احساس ان اجزاء جسم کو ہوتا ہے جو مٹی کی شکل میں موجود ہیں'' صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ مٹی تو بے جان چیز ہے، وہ کس طرح عذاب و ثواب کا احساس کر سکتی ہے؟

۲۵ جواب ۷۰

وہ اجزاء جسم جو مٹی کی شکل میں ہیں، اگر روح کے تعلق سے خالی ہوں تو پھر بے شک وہ عذاب وثواب محسوس نہیں کر سکتے، لیکن اگر ان کے ساتھ روح کا تعلق ہو تو اس کی وجہ سے وہ عذاب وثواب محسوس کر سکتے ہیں، اور اسی دوسری صورت کے ہم قائل ہیں۔ یعنی ان اجزاء کے ساتھ روح کا تعلق ہوتا ہے، اس لئے انہیں عذاب و

ثواب کا احساس بھی ہوتا ہے۔

۲۶ سوال ۷۱

اگر ایک ہی قبر میں مؤمن اور کافر کو دفن کر دیا جائے تو اسلامی نظریہ کے مطابق مؤمن کو ثواب ملے گا اور کافر کو عذاب۔ حالانکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک ہی قبر میں ایک شخص طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہو اور دوسرا انواع واقسام کی نعمتیں اور مسرت حاصل کرے؟

۲۶ جواب ۷۱

یہ اسی طرح ممکن ہے۔ جس طرح یہ ممکن ہے کہ ایک بستر پر ایک شخص عالم خواب میں انواع واقسام کی تکلیفوں میں مبتلا ہو اور اس کا ساتھی عالم خواب میں اپنے پیارے پیارے دوستوں کے ساتھ نفیس نفیس باغوں کی سیر کر رہا ہو۔

اور جس طرح یہ ممکن ہے؛ بلکہ واقعہ ہے کہ ایک آدمی نمرود ① کی جلائی ہوئی آگ کے قریب بھی نہیں پہنچا تھا کہ اس کی داڑھی جل گئی، لیکن اسی آگ میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ② ڈالے گئے تو اس آگ نے ان کو ذرا بھی گزند نہ پہنچایا؛ بلکہ ان کے لئے گلزار بن گئی۔

اور جس طرح یہ ممکن ہے کہ ایک شخص آگ میں سے صحیح وسالم گزر جاتا ہے لیکن دوسرا اگر اسی آگ سے گزرے تو جل جاتا ہے۔ آخر کیوں---؟ صرف اس

---

① ← نمرود بابل کا بادشاہ تھا۔ (بابل کلدانیوں کا دارلحکومت تھا۔ یہ علاقہ بغداد کے ارد گرد پھیلا ہوٗا تھا) نمرود کے باپ کا نام کوش بن حام تھا۔ اس بادشاہ کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پیغمبر کا ہم عصر تھا۔ مذہبی روایات کے مطابق خدائی کا دعویدار تھا۔

لئے کہ آگ میں سے گزرنے والے کے پاس کوئی ایسا شعبدہ یا دوا ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ آگ سے محفوظ رہتا ہے اور دوسرے شخص کے پاس چونکہ یہ چیز نہیں ہوتی اس لئے وہ جل جاتا ہے۔ بعینہ یہی صورت یہاں بھی سمجھ لیجئے! کہ جو لوگ اچھے اعمال کرتے ہیں اور رضائے الٰہی کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ اپنے نور رحمت سے ایسا منور فرما دیتا ہے کہ کوئی بھی چیز ان کو ضرر نہیں پہنچا سکتی؛ بلکہ جو چیز اوروں کے لئے مضر ہو، اگر وہ چاہیں تو وہی ان کے حق میں مفید ہو جاتی ہے۔ اور جو لوگ برے عمل کرتے ہیں اور ساری زندگی فسق و فجور میں بسر کر دیتے ہیں، ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے ان کا باطن اس قدر غلیظ اور گندہ ہو جاتا ہے کہ ان کو ہر طرف

---

② ← حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے نبی اور خلیل تھے۔ عام روایات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام ۲۳۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ عراق کے قدیم شہر 'ار' میں پیدا ہوئے۔ اس شہر کے لوگ بت پرست تھے۔ ابراہیم علیہ السلام جوان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی اور آپ نے دین کی تبلیغ شروع کر دی۔ ایک دن؛ جبکہ شہر کے لوگ کہیں باہر گئے ہوئے تھے تو آپ نے معبد میں جا کر سارے بت توڑ دیے۔ اس پر بادشاہ (نمرود) نے آپ کو بھڑکتے ہوئے الاؤ میں پھنکوا دیا۔ لیکن خدا کے حکم سے آگ ٹھنڈی ہو گئی اور آپ کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ کچھ عرصے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین ہجرت کر گئے اور اپنے دین کی تبلیغ کے لئے دو مقام منتخب کیے، ایک بیت المقدس اور دوسرا مکہ۔ آپ کی دو بیویاں تھیں، ہاجرا اور سارہ۔ ہاجر کے بطن سے اسماعیل علیہ السلام تھے اور سارہ سے اسحاق علیہ السلام۔ آپ نے اسماعیل علیہ السلام کی مدد سے کعبے کو تعمیر کیا۔ آپ

ایک الہامی خواب کی بنا پر اپنے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کو تیار ہو گئے مگر اللہ نے اسماعیل علیہ السلام کی بجائے دنبہ ذبح کروا دیا۔ عیدالاضحیٰ اسی واقعے کی یادگار ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور اسی نسبت سے مسلمان ملتِ ابراہیمی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ثعلبی کے بقول ابراہیم علیہ السلام نے ایک سو بیس سال کی عمر میں ختنہ کرایا اور ۱۷۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔

عذاب ہی عذاب اور مصیبت ہی مصیبت نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس عذاب اور مصیبت سے محفوظ رہنے کے لئے ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔

نیز جس طرح ایک شخص اچھے عمل کرتا ہے اور دوسرا شخص اسی جگہ برے عمل کرتا ہے تو برے شخص کے اعمال بد، نیک شخص کے اعمال نیک پر اور نیک شخص کے اعمال نیک، برے شخص کے اعمال بد پر اثر انداز نہیں ہوتے، بعینہ اسی طرح اچھے اعمال کے ثمرات بھی برے اعمال کے نتائج پر اور برے اعمال کے نتائج اچھے اعمال کے ثمرات پر اثر انداز نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا ایک ہی قبر میں ایک شخص کو عذاب اور دوسرے کو ثواب ملنا نہ صرف یہ کہ ممکن ہے؛ بلکہ واقع ہے۔

سوال ۲۷

اگر کسی شخص کو مرنے کے بعد درندے یا پرندے کھا جائیں تو اس کے عذاب وثواب کی کیا صورت ہوگی؟ کیا اسے درندوں یا پرندوں کے پیٹ میں عذاب وثواب ہوگا؟ تو یہ ناممکن ہے، کیونکہ اس صورت میں درندوں یا پرندوں کو تکلیف یا راحت محسوس ہونی چاہئے کیونکہ عذاب وثواب ان کے پیٹ میں ہورہا ہے۔ حالانکہ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ اور اگر پیٹ سے نکلنے کے بعد ہو تو یہ بھی ناممکن ہے، کیونکہ پیٹ سے تمام اجزاء تو نہیں نکلتے؛ بلکہ بعض اجزاء خون میں مل جاتے ہیں۔ اب جو اجزاء خون میں مل جائیں ان کے عذاب وثواب کی کیا صورت ہوگی؟'

جواب ۲۷

اولاً ---ہم تسلیم ہی نہیں کرتے کہ انسان کے اجزاء ہضم ہوکر خون میں شامل ہوجاتے ہیں؛ بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ ان اجزاء کو ہضم ہونے سے پہلے ہی ملائکہ جمع کرلیتے ہیں اور یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ جس طرح ایک شخص کے بارے میں حدیث شریف

میں آیا ہے کہ اس نے عذاب الٰہی کے خوف سے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد مجھے جلا دینا اور راکھ کو تیز آندھی کے دن سمندر کے کنارے اڑا دینا کیونکہ میں بہت گنہگار ہوں، اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے پکڑ لیا تو مجھے سخت عذاب دے گا۔

چنانچہ اس کی اولاد نے اس کی وصیت پر عمل کیا، لیکن اس کے باوجود ملائکہ نے آندھی میں اڑتے ہوئے ذرات کو جمع کر لیا اور سوال و جواب کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کر دیا۔ [بخاری، ج اول]

اگر ملائکہ آندھی میں اڑتے ہوئے راکھ کے ذرات جمع کر لیتے ہیں تو ان کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ کسی انسان کے اجزاء کو ہضم ہونے سے پہلے ہی جمع کر لیں۔

ثانیاً---اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ پیٹ کے اندر عذاب و ثواب ہوتا ہے تو اس میں بھی کوئی اشکال نہیں ہے۔ کیونکہ انسانی جسم میں ہزاروں تغیرات ہوتے ہیں اور انسان ان سے ناواقف ہوتا ہے۔ انسان کے معدے میں کیڑے بنتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں، لیکن انسان کو نہ ان کے پیدا ہونے کا پتہ چلتا ہے نہ مرنے کا اور نہ ہی ان کے پیٹ میں چلنے پھرنے کا احساس ہوتا ہے۔ جدید سائنس کے مطابق مختلف قسم کے جراثیم میں خوفناک جنگ ہوتی ہے۔ اگر صحت کے جراثیم غالب ہوں تو مرض حملہ آور نہیں ہو سکتا اور اگر مرض کے جراثیم غالب ہو جائیں تو انسان بیمار پڑ جاتا ہے۔ حالانکہ اس خوفناک جنگ کو انسان بالکل محسوس نہیں کرتا۔ اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ درندوں اور پرندوں کے پیٹ میں عذاب ہو؛ بلکہ خون کے مختلف ذرات کو عذاب ہو اور جس انسان کے وہ اجزاء ہوں، اس کو عذاب و تکلیف کا پوری طرح احساس بھی ہو، مگر خود وہ درندے یا پرندے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہ کریں۔

۲۸ سوال ۷۳

روز قیامت اور عالم برزخ کے ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اچھے اور برے اعمال کی جزا وسزا تو تناسخ اور آواگون کی صورت میں بھی مل سکتی ہے، یعنی ایک جنم کے بعد اسی روح کو دوبارہ کسی دوسرے جسم میں ڈال کر دنیا میں بھیجا جائے اور اس نئے جنم میں اس کے اچھے اور برے اعمال کا بدلہ دیا جائے۔ اگر اس کے سابقہ اعمال اچھے ہوں تو اسے عیش و آرام دیا جائے اور اگر برے ہوں تو ذلت و خواری نے رکھا جائے، جیسا کہ ہنود (ہندوؤں) کا مذہب ہے۔ اس صورت میں قیل وقال کی زیادہ دقتیں بھی نہیں اٹھانی پڑتیں۔

۲۸ جواب ۷۳

دنیا دار الجزا نہیں ہوسکتی اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔

اولاً---اس لئے کہ دنیا میں ایسی کوئی حالت نہیں جس میں امتحان نہ ہو۔ اگر کوئی شخص خوشحال اور امیر ہے تو خوشحالی اور امیری ہی میں ہمدردی، مساکین نوازی، فیاضی، سخاوت اور تواضع وغیرہ کے اختیار کرنے کے ساتھ اس کی آزمائش ہے۔ اور اگر کوئی غریب وفقیر ہو تو اس کی فقیری ہی میں اس کے صبر واستقلال، عزم و ثبات اور رضا بالقضاء وغیرہ کا امتحان ہے۔ پس جب دنیا کی ہر حالت، حالتِ امتحان ہے تو دنیا کی کوئی حالت بھی حالتِ جزا نہیں ہوسکتی، کیونکہ جزا امتحان کے بعد ہوتی ہے، نہ کہ امتحان کے ساتھ۔

ثانیاً---اس لئے دنیا میں کوئی بھی انسان، خواہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو، ایسا نہیں جو مکمل طور پر غموں سے فارغ ہو اور کسی رنج والم سے آشنا نہ ہو۔

سلاطین میں سے سکندر اور دارا ①، جن کی سلطنتیں اور امارتیں، صفحات تاریخ میں ابھی تک چمک رہی ہیں، کے حالات دیکھئے! انہیں ساری عمر کہیں آرام سے بیٹھ کر کھانا نصیب

---

①← سکندر اور دارا، دونوں کا تذکرہ مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) سکندرِ اعظم (ALEXANDER THE GREAT) (۳۵۶۔۳۲۳ ق م) جسے اسکندرِ سوم بھی کہا جاتا ہے۔ مقدونیہ کا بادشاہ اور اپنی وقت کی بیشتر معلومہ دنیا کا فاتح تھا۔ اپنے والد فِلپ دوم کے قتل کے بعد، مقدونیہ کے تخت پر بیٹھا۔ اندرونی شورشوں اور اردگرد کی ریاستوں کو فتح کرنے کے بعد ایران پر حملہ کیا، اور دریائے گرامیکس کے کنارے ایرانی فوج کو شکست دی اور سابق یونانی مقبوضات پر دوبارہ قبضہ کیا۔ پھر فونیشیا میں ایرانی بحری اڈوں پر قبضہ کر کے ایرانی بحری طاقت کو مفلوج کر دیا۔ بعد ازاں اِسّس کے مقام پر ایرانیوں کو تباہ کن شکست دی۔ ۳۳۲ ق م میں مصر فتح کیا اور شہر اسکندریہ کی بنیاد رکھی۔ ۳۳۱ ق م میں مشرق کا رخ کیا اور میسوپوٹیما (عراق) کے میدان میں، گوگامیلا کے مقام پر ایران کے بادشاہ دارائے اعظم (Darius) کی طاقت کا قلع قمع کیا۔ بابل، سوسا، پرسے پولس اور اکباتانا سمیت تمام ایرانی مقبوضات قبضے میں آگئے اور یہاں سے اسے سونے چاندی کے بے حساب خزانے ہاتھ لگے۔

ایران پر گرفت مضبوط کرنے کے بعد سکندر درۂ خیبر کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا، اور ۳۲۶ ق م میں دریائے سندھ عبور کر کے پنجاب کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ دریائے جہلم اور چناب کا درمیانی علاقہ راجا پورس کے زیرِ نگیں تھا۔ یونانیوں نے دریائے جہلم پار کر کے پورس کی فوج پر حملہ کر دیا۔ پورس کے ہاتھی حملہ آوروں کے تیروں سے بوکھلا کر الٹے قدموں بھاگ پڑے اور اپنے ہی فوجیوں کو کچل ڈالا۔ بعض روایات کے بموجب پورس گرفتار ہو کر سکندر کے حضور پیش ہوا تو اس نے پوچھا ''تم سے کیا سلوک کیا جائے؟'' پورس نے جواب دیا ''جو ایک بادشاہ دوسرے سے کرتا ہے۔'' سکندر نے پورس کو نہ صرف اس کی سلطنت واپس کر دی؛ بلکہ سارا پنجاب اس کی نگرانی میں دے دیا۔ سکندر تاریخ میں پہلا ملٹری جینیس تھا جس نے دنیا فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ایک عالمی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔

(۲) دارا سے مراد دارا اوّل ہے (Darius-I) ایران کا عظیم شہنشاہ اور فاتح۔ ☜

نہ ہوسکا۔ حکماء میں سے سقراط اور افلاطون ① ہیں، جو اپنی حکمت وفلسفہ کے لحاظ سے تمام حکمائے متاخرین کے پیشوا ہیں، ان کے حالات زندگی دیکھئے، کہ انہوں نے کن کن پریشانیوں اور دشواریوں میں رہ کر اپنی زندگیاں بسر کی ہیں۔ شہروں سے بھاگ کر پہاڑوں اور جنگلوں کو اپنا مسکن بنایا، لیکن وہاں بھی زندگی کے دن چین سے گزارنے نصیب نہ ہوئے، بالآخر نہایت پریشانی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ہنود کے بزرگوں اندر ② اور رام چندر ③ کو دیکھئے! جنہیں ہندو دیوتا مانتے

گشتاسپ کا بیٹا تھا جو ہخامنشی خاندان سے تھا۔ کمبوجیا کی وفات کے بعد مدائن کے تخت پر بیٹھا۔ تین سال تک اندرونی بغاوتوں کو فرو کرنے میں مصروف رہا۔ پھر سلطنت کے نظم ونسق کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا۔ سلطنت کو ۲۸ صوبوں میں تقسیم کیا۔ ان میں گندھارا، مکران، بلوچستان، عرب اور مصر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے عہد میں ایشیائے کوچک، شمالی یونان، مصر، عرب، شام، عراق، افغانستان اور سندھ و پنجاب ایرانی سلطنت کا حصہ تھے۔ دنیا میں اتنی بڑی سلطنت پھر کبھی قائم نہیں ہوئی۔

①← سقراط اور افلاطون کا تذکرہ تیسرے باب کے صفحہ نمبر ۹۲-۹۳ پر گزر چکا ہے۔

②← اندر راجا ہندی دیو مالا کے مطابق دیوتاؤں کے مخلوق دیوتا جو سورگ (اندر کا آسمان) پر رہتا ہے۔ آکاس اور سورگ اس کے تابع ہیں۔ اپسرائیں اور گندھرب اس کے خدمت گزار ہیں۔ اس کی ہزاروں آنکھیں ہیں جن سے وہ پتال اور آکاس کی ہر شے دیکھتا ہے۔ وجر (شہابہ) اس کا ہتھیار ہے۔ مینہ برساتا ہے۔ رگ وید کے بہت سے منتر اس کے بارے میں ہیں۔

③← رام چندر جی، وشنو کے ساتویں اوتار (7th Incarnation)۔ ہندوؤں کی ایک مقدس کتاب راماین (دیکھیے) کے مطابق شمالی ہند کی ایک ریاست ایودھیا (اودھ) پر سورج بنسی خاندان کا ایک کھتری راجہ دسہرتھ راج کرتا تھا، اس کی تین بیویاں اور چار بیٹے (رام چندر جی، لکشمی، شتروگن اور بھرت) تھے۔ رام چندر جی اپنی شہ زوری، دلیری اور نیک دلی کے سبب پرجا میں بہت ہر دل عزیز تھے۔ ☜

ہیں، ساری عمر عورتوں ہی کے جھگڑوں میں پڑے رہے۔ اسی طرح لنکا (سری لنکا) کے راجہ راون کا بھی یہی حشر ہوا۔ یہ تو اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا تذکرہ تھا۔ اسی طرح اس دنیا میں کوئی بھی انسان، خواہ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ ہی کیوں نہ ہو، ایسا نہیں کہ تمام تر نعمتوں اور راحتوں سے محروم ہو اور کوئی خوشی اس کو نصیب نہ ہو۔

بھنگی اور چمار (Scavengers & Curriers) جنہیں بالخصوص ہندو مذہب

ان کی شادی متھلا پوری (موجودہ جنک پور، واقع نیپال) کے راجا جنک کی بیٹی سیتا سے ہوئی تھی۔ راجا دسہرتھ کی چھوٹی رانی کیکئی نے کسی جنگ میں راجہ کی جان بچائی تھی، جس پر راجہ نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے بدلے میں وہ اس کی خواہش پوری کرے گا۔

راجہ دسہرتھ لبِ گور ہوا تو اس نے رام چندر جی کو اپنا جانشین بنانا چاہا، لیکن کیکئی نے اسے اپنا عہد یاد دلایا اور مانگ کی کہ وہ اس کے لڑکے بھرت کو اپنا ولی عہد نامزد کرے اور رام چندر جی کو چودہ برس کا بن باس دے دیا جائے۔ راجا نے رام چندر جی کو کیکئی کی خواہش اور اپنے عہد سے آگاہ کیا تو سعادت مند اور وفا کیش بیٹے نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور جنوبی ہند کے جنگلوں میں چلا گیا۔ اس بُرے وقت میں اس کی بیوی سیتا اور بھائی لکشمن (لچھمن) نے اس کا ساتھ دیا۔

ایک دن لنکا کے بدقماش راجا، راون، کا اس جنگل میں گزر ہوا اور وہ سیتا کو اُٹھا کر لے گیا۔ رام چندر جی نے بندروں کے راجہ سکریو کی فوج (جس کا سپہ سالار ہنومان تھا) کی مدد سے لنکا پر چڑھائی کی اور راون کو ہلاک کر کے سیتا جی کو رہا کرایا۔ دسہرا کا تہوار اسی فتح کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اس عرصے میں چودہ سال پورے ہو گئے تھے۔ رام چندر جی سیتا اور لکشمی کے ہمراہ ایودھیا واپس آ گئے، جہاں ان کا سوتیلا لیکن نیک نہاد بھائی بھرت ان کی کھڑاویں تخت پر رکھ کر، ان کے نام سے راج کر رہا تھا۔ ان کی آمد کی خوشی میں گھر گھر چراغاں کیا گیا۔ ہولی کا تہوار اسی واقعے کی یادگار ہے۔ ہندو رام چندر جی کو وشنو بھگوان کا ساتواں اوتار مانتے ہیں۔ محققین تا حال آپ کے زمانے کا تعین نہیں کر سکے۔

میں سب سے زیادہ حقیر وذلیل تصور کیا جاتا ہے، وہ بھی جب دن بھر کی محنت مزدوری سے فارغ ہوکر تھکے ماندے گھر لوٹتے ہیں اور اپنے جگر گوشوں (بیٹوں اور بیٹیوں) کو سینے سے لگا کر پیار کرتے ہیں اور گود میں اٹھاتے ہیں، تو اس وقت ان پر خوشی کا جو عالم طاری ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں وہ دوسری تمام خوشیوں اور مسرتوں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔

پس جب ہر خوشی کی حالت غم واندوہ سے مخلوط ہے تو یہ حالت اس شخص کی جزا نہیں ہوسکتی جس نے تمام دنیاوی عیش وعشرت کو ٹھکرا کر اپنی ساری زندگی عبادت اور یاد الٰہی میں گزار دی ہو، کیونکہ اس نے تو ساری عمر عبادت میں صرف کر دی اور جزا کے طور پر اسے وہ حالت ملی جو غموں اور دکھوں سے آلودہ ہے---کیا یہی انصاف ہے؟

اور---جبکہ ہر غم کی حالت خوشیوں اور مسرتوں سے مخلوط ہے، تو یہ حالت کسی ایسے شخص کی سزا نہیں ہوسکتی جس نے عبادت الٰہی سے منہ موڑ کر اپنی ساری زندگی فسق وفجور اور ظلم وستم میں گزاری ہو۔ کیونکہ اسے سزا کے طور پر ایسی حالت ملی ہے جس میں خوشیوں کے ایسے ایسے عالم ہیں جن میں کھو کر تمام غم بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ اس کی گزشتہ تمام عمر نافرمانی اور برے اعمال میں گزری ہے۔

ثانیاً---اس لئے کہ فرض کیجئے ایک شخص مثلاً سکندر اعظم ① کو ساری دنیا

---

① ← سکندر اعظم جسے ذوالقرنین بھی کہا جاتا ہے، اس کے متعلق سورہ کہف میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک زبردست بادشاہ تھا۔ اس نے تین بڑی مہمیں سر کیں۔ پہلی مہم میں وہ اس مقام پر پہنچا جہاں سورج غروب ہوتا ہے۔ یہاں اسے ایک ایسی قوم ملی جس کے بارے میں اللہ نے اسے اختیار دیا کہ چاہے تو اسے سزا دے اور چاہے تو اس کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ ذوالقرنین نے کہا کہ جو شخص ظالم ہوگا اسے ہم سزا دیں گے اور مرنے کے بعد اللہ بھی اسے سخت عذاب دے گا؛ البتہ مومن وصالح کو نیک جزا ملے گی۔ دوسری مہم میں وہ اس جگہ پہنچا جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے۔ وہاں اسے ایسے لوگ ملے جن ☜

کی حکومت مل گئی اور اس نے اس حالت میں اپنی ساری زندگی عدل وانصاف اورحق پرستی میں گزار دی۔ اب مرنے کے بعد دوسرے جنم میں اسے اپنے سابقہ اعمال کا کیا انعام ملے گا؟ کیا اس کو وہی حکومت دوبارہ دی جائے گی، یا اس سے زیادہ، یا اس سے کم؟ اگر وہی حکومت دوبارہ دی گئی تو اس کو انعام ہی کیا ملا؟ یہ حکومت تو اسے پہلے جنم میں بھی حاصل تھی۔ انعام کے طور پر تو کوئی نئی چیز ملنی چاہیئے۔ اور وہی حکومت ملی بھی تو موت کے قسم قسم کے سکرات ومصائب کے بعد--- یہ کیا انعام ہوا؟ اس کی مثال تو ایسی ہے جس طرح کوئی غلام کھانا کھا رہا ہو اور آقا اس سے کہے کہ ''تم کھانا کھاتے کھاتے میرا نام بھی لیتے جاؤ۔ تو میں تمہیں انعام دوں گا'' اور غلام اس پر عمل کرتے ہوئے کھانا کھاتے وقت آقا کا نام انتہائی پابندی اور تعظیم کے ساتھ لیتا جائے، مگر تھوڑی دیر بعد آقا اس سے کھانا چھین کر دس بارہ جوتے لگائے اور پھر اس کو وہی کھانا لوٹا کر دے دے اور کہے ''یہ ہے تمہارا انعام جو تم کھانے کے دوران میرا نام لیتے رہے ہو'' کیا کوئی بھی ذی عقل آدمی اس کو انعام کہہ سکتا ہے؟

اور --- اگر اسے پہلی حکومت سے زیادہ کچھ ملے، تو یہ اس دنیا میں تو

کے لئے کوئی آڑ نہیں تھی (بقول مفسرین وہ ننگے اور بے گھر تھے) بات نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے یاجوج ماجوج کی تباہ کاریوں کا شکوہ کرتے ہوئے اس سے درخواست کی کہ وہ ان کے اور یاجوج ماجوج کے درمیان ایک بند بنا دے۔ ذوالقرنین نے ان سے لوہے کی چادریں منگوائیں اور پھر ایک دیوار بنا دی جس پر تانبا پگھلا کر ڈالا گیا۔ ذوالقرنین نے کہا کہ یہ اللہ کا فضل ہے کہ مجھ سے اتنا بڑا کام ہوگیا۔ لیکن جب میرے رب کا مقرر کردہ وقت آئے گا تو وہ اس کو ریزہ ریزہ کردے گا۔

یہ بادشاہ کس زمانے میں تھا، اس کا اصلی نام کیا تھا اور اس کو ذوالقرنین کیوں کہا جاتا تھا؟ یہ تفصیلات جاننے کے لئے کتب تفسیر کا مطالعہ کیا جائے۔

ناممکن ہے، کیونکہ ساری دنیا کی حکومت تو اسے پہلے ہی حاصل تھی اس سے زیادہ کیا صورت ہو سکتی ہے؟

اور ---اگر پہلے سے کم دی گئی تو انعام کی بجائے اس کو سزا ملی کہ اعلیٰ مرتبہ سے ادنیٰ مرتبہ دیا گیا۔

اسی طرح فرض کیجئے کہ ایک بھنگی نے اپنی ساری زندگی فسق وفجور میں گزار دی، تو اس کو دوسرے جنم میں اپنے سابقہ برے اعمال کی کیا سزا ملے گی؟ کیا اس کو دوبارہ بھنگی ہی کی حالت میں لایا جائے گا، یا اس سے بہتر حالت میں، یا اس سے کمتر حالت میں؟

اگر اس کو دوسرے جنم میں بھنگی بنایا گیا تو اس کو برے اعمال کی سزا ہی کیا ملی؟ یہ حالت تو اسے پہلے بھی حاصل تھی اور اگر پہلے سے بہتر حالت دی گئی تو اس کو سزا کی بجائے انعام ملا کہ ادنیٰ سے اعلیٰ مرتبہ دیا گیا۔

اگر کہا جائے کہ اس کو دوسرے جنم میں پہلے سے بھی کمتر حالت میں رکھا جائے گا، تو یہ کمتر حالت انسانی قالب میں ہو گی یا حیوانی قالب میں؟ انسانی قالب میں تو ظاہر ہے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ غلاظت بردار بھنگی سے زیادہ ذلیل وحقیر نوع انسانی میں کسی کو بھی تصور نہیں کیا جاتا۔ اور حیوانی قالب میں بھی نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ حیوانی قالب والی عمر ختم ہونے کے بعد تیسرے جنم میں اسے کس حالت میں رکھا جائے گا؟ اچھی حالت میں، یا بری حالت میں؟ اگر اچھی حالت میں رکھا جائے گا تو کون سے اعمال صالحہ کے انعام میں اور اگر بری حالت میں رکھا گیا تو کون سے اعمال قبیحہ کی سزا میں؟ کیونکہ حیوان تو عقل وشعور نہیں رکھتا کہ اس کے اعمال نیکی اور بدی کے ساتھ متصف ہوں اور اس کو جزا وسزا ملے۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ دنیا دار الجزا نہیں ہو سکتی۔

اگر کہا جائے کہ بھنگی کو دوسرے قالب میں بھی بھنگی ہی بنایا جائے گا، مگر آپ کا یہ کہنا کہ اس صورت میں اس کو سزا ہی کیا ملی؟ غلط ہے کیونکہ اس کو اگرچہ دوسرے

قالب میں ڈالے جانے کے بعد سزا نہیں ہوئی، لیکن ایک جنم سے دوسرے جنم میں منتقل ہونا ہی باعث تکلیف ہے اور یہی تکلیف ان کی سزا ہے۔تو جواباً عرض ہے کہ اگر ایک جنم سے دوسرے جنم میں منتقل ہونے کے دوران جو تکلیف ہوتی ہے، اسی کو برے اعمال کی سزا تصور کیا جائے، تو یہ سزا جسمانی حالت میں نہ ہوگی؛ بلکہ ایک جسم سے نکلنے اور دوسرے جسم میں داخل ہونے کے درمیان جو روحانی حالت ہے، اس میں ہوگی۔ اس صورت میں آپ کو ایسی روحانی حالت تسلیم کرنا پڑے گی جس میں سزا ملتی ہے۔ حالانکہ آپ اس کے منکر ہیں، کیونکہ آپ کے عقیدے کے مطابق سزا دوسری جسمانی حالت میں ملتی ہے۔ نیز اس صورت میں یہ بھی دقت ہے کہ آپ کے نزدیک ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہونا جس طرح گنہگاروں کے لئے ہے اسی طرح نیکوکاروں کے لئے بھی ہے۔ اگر ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہونا باعث تکلیف وعذاب ہے، تو یہ عذاب گنہگاروں اور نیکوکاروں کو یکساں ملے گا---این چہ بوالعجبی است؟

رابعاً---اس لئے کہ عذاب کو عذاب تب ہی کہا جا سکتا ہے جبکہ اس کی وجہ سے اس شخص کو جسے عذاب دیا جا رہا ہے، دکھ اور تکلیف محسوس ہو۔ حالانکہ تمام شودر، (The Untouchables) خواہ بھنگی ہوں یا چمار، اپنے اپنے کسب اور کام اور عمل میں انتہائی خوش رہتے ہیں۔ اگر ان کا کسب برا لگتا ہے تو دوسروں کو۔ ان کو اسی میں راحت اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اگر ان کی طبیعت اس سے نفرت کرتی تو وہ یہ کام کرتے ہی کیوں؟ اور جس کام سے وہ خوش ہوں، اسے عذاب کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟

اگر کہا جائے کہ عذاب اور سزا کسی کام کے ذریعے سے نہیں؛ بلکہ دکھ و رنج بیماری اور تکلیف وغیرہ کے ذریعے دیا جاتا ہے، تو یہ بات ایک تو آپ کے عقیدے کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ بیماری اور تکلیف وغیرہ تو جس طرح برے لوگوں پر آتی ہے، اسی طرح اچھے لوگ بھی اس میں مبتلا ہوتے ہیں؛ بلکہ حیوانات تک بیمار ہوتے

ہیں۔ اگر بیماری اور تکلیف وغیرہ عذاب ہو، تو اس عذاب میں نیک و بد، انسان اور حیوان سب ہی برابر ہوئے---یہ اچھا انصاف ہے!

معلوم ہوا کہ یہ دنیا دارالجزا نہیں ہوسکتی۔

خامساً---اس لئے کہ یہ تو ناممکن ہے کہ دنیا کی ابتدا کوئی نہ ہو۔ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے کی ابتداء ہے۔ اس صورت میں سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جو انسانی افراد پیدا کئے تھے، وہ کس حالت میں زندگی بسر کرتے تھے؟ سب کے سب اچھی حالت میں، یا سب کے سب بری حالت میں، یا بعض اچھی حالت میں اور بعض بری حالت میں؟ تمام صورتوں میں سوال یہ ہے کہ اگر اچھی حالت میں بسر کرتے تھے تو کون سے اعمال صالحہ کی جزا میں؟ اور اگر بری حالت میں بسر کرتے تھے تو کون سے برے اعمال کی سزا میں؟ ظاہر ہے کہ یہ جنم ان کا سب سے پہلا جنم تھا۔ اس سے پہلے ان کے اچھے یا برے اعمال سرے سے تھے ہی نہیں، تاکہ ان کی اچھی بری حالت کو جزا وسزا قرار دیا جاسکے۔

سادساً---اس لئے کہ جو ارواح پہلے پیدا کی گئیں اور اجسام میں ڈالی گئیں، اگر وہی ارواح بار بار لوٹ کر دنیا میں آتی ہیں اور نئے اجسام میں پڑتی ہیں اور کوئی نئی روح پیدا نہیں ہوتی۔ تو دنیا میں افراد انسانی کی تعداد ایک ہی رہتی اور اس میں کوئی ترقی نہ ہوتی۔ حالانکہ یہ مشاہدہ کے خلاف ہے، کیونکہ موجودہ زمانے میں جو افراد انسانی کی تعداد ہے، وہ سابقہ زمانہ کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو نئے اجسام بنتے ہیں اور ان میں جو ارواح ڈالی جاتی ہیں، وہ ارواح ان اجسام میں داخل ہونے سے پہلے کہاں تھیں؟ عالمِ اجسام میں یا عالمِ ارواح میں؟ اگر عالمِ اجسام میں تھیں تو کون سے جسم میں؟ انسانی جسم میں یا حیوانی جسم میں؟ نباتی جسم

میں یا جمادی جسم میں؟

اگر کہا جائے کہ انسانی جسم میں تھیں، تو یہ اس لئے غلط ہے کہ اس صورت میں افرادانسانی کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ بلاشک وشبہ اضافہ ہورہا ہے۔

اگر کہا جائے کہ حیوانی، نباتی یا جمادی جسم میں تھیں، تو یہ اس لئے غلط ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اگر کسی روح کو حیوانی، نباتی یا جمادی جسم سے نکال کر اشرف المخلوقات کے جسم میں داخل کیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس روح نے حیوانی، نباتی یا جمادی جسم میں کون سے اچھے اعمال کئے تھے کہ ان کے بدلے میں اسے اشرف المخلوقات کے قالب میں لایا گیا؟ ظاہر ہے کہ حیوانات، نباتات اور جمادات عقل وشعور نہیں رکھتے، اس لئے ان کے کسی عمل پر ان کو جزا نہیں دی جاسکتی۔

علاوہ ازیں نباتات اور جمادات میں احساس اور حرکت بالارادہ دونوں ہی مفقود ہیں۔ حالانکہ روح کے ساتھ احساس اور حرکت بالارادہ لازم ہیں۔ اس لئے کسی نبات یا جماد میں روح کا ہونا صریحاً غلط ہے۔

اگر کہا جائے کہ وہ ارواح ان جسموں میں ڈالے جانے سے پہلے عالم ارواح میں تھیں تو پھر اس جسم کا، جس میں ایسی روح ہو جو پہلے کسی جسم میں نہیں تھی، یہ پہلا جنم ہوگا۔ اب اس جنم میں وہ شخص اچھی زندگی گزارے گا یا بری؟

اگر اچھی گزارے گا تو کون سے اعمال صالحہ کی جزا کے طور پر، اور اگر بری گزارے گا تو کون سے برے اعمال کے بدلے میں؟

لہٰذا یہ کہنا کہ اچھی بری حالت، سابقہ اعمال کی جزاوسزا ہے، قطعاً غلط ہے۔

سابعاً --- اس لئے کہ بعض امراض، مثلاً ہیضہ وطاعون وغیرہ سے، چند دنوں؛ بلکہ چند گھنٹوں میں ہزاروں نفوس قید جسم سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح

جنگوں میں بے شمار آدمی مرکھپ جاتے ہیں۔ حال ہی میں جو دوسری جنگ عظیم ① ہوئی ہے، اس کے مقتولوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ارواح کے لئے دوسرا عالم نہ ہو؛ بلکہ ارواح ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی ہوں، تو چاہیے کہ جس طرح اموات اچانک بے شمار ہو جاتی ہیں، اسی طرح اچانک بے شمار زندگیاں بھی عالم وجود میں آ جائیں۔ حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بے شمار لوگ اچانک دنیا میں آ جائیں۔ پیدائش کا عمل ہمیشہ بتدریج ہوتا ہے۔ اب جو بے شمار ارواح دفعۃً جسموں سے نکلتی ہیں، وہ دوسرے جسم میں پڑنے سے پہلے کہاں رہتی ہیں؟ کیا ان کے لئے کوئی اور جگہ مقرر ہے، یا اسی عالم میں انسانوں کی بجائے حیوانات، نباتات یا جمادات میں داخل ہو جاتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ انسانی روح کا نباتات اور جمادات میں داخل ہونا صریحًا خلاف عقل ہے، کیونکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ روح کے ساتھ احساس اور حرکت ارادی لازم ہے اور یہ دونوں چیزیں نباتات اور جمادات

---

① ← جنگِ عظیم دوم کا آغاز ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہوا جب پولینڈ پر جرمنی حملہ آور ہوا اور برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یہ جنگ کئی سال تک جاری رہی۔ اس میں ۶۱ ملکوں نے حصہ لیا۔ ان کی مجموعی آبادی دنیا کی آبادی کا ۸۰ فی صد تھی اور فوجوں کی تعداد ایک ارب سے زائد۔ تقریباً ۴۰ ملکوں کی سرزمین جنگ سے متاثر ہوئی اور ۵ کروڑ کے لگ بھگ لوگ ہلاک ہوئے۔ سب سے زیادہ نقصان روس کا ہوا۔ تقریباً ۲ کروڑ روسی مارے گئے اور اس سے کہیں زیادہ زخمی ہوئے۔ روس کے ۱۷۱۰ شہر اور قصبے، ۷۰,۰۰۰ گاؤں اور ۳۲,۰۰۰ کارخانے تباہ ہوئے۔ اسی طرح کی تباہی دیگر ملکوں میں بھی ہوئی۔ اس ہولناک جنگ کا خاتمہ ۱۹۴۵ء میں ہوا جب امریکہ نے جاپان کے دو مشہور شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے اور جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے۔

میں مفقود ہیں۔ اسی طرح کسی روح انسان کا حیوانات میں داخل ہونا بھی غلط ہے، کیونکہ روح انسانی کے ساتھ احساس اور حرکت ارادی کے علاوہ عقل بھی ضروری ہے اور عقل حیوانات میں مفقود ہے۔

علاوہ ازیں انسانی روح کا نوع انسانی کے علاوہ کسی دوسرے جسم میں پڑنا اس لئے بھی خلاف عقل ہے کہ قانون عدل و مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ جس نوع میں کمی ہو، اسی نوع میں اضافہ بھی ہو۔ نہ یہ کہ کمی تو واقع ہو نوع انسانی میں اور اضافہ نوع حیوانی وغیرہ میں ہو جائے۔

نیز یہ اس لئے بھی غلط ہے کہ جب یہ انسانی روح حیوانات وغیرہ سے نکل کر کسی انسانی جسم میں داخل ہوگی، تو وہ انسان اپنی زندگی کس حالت میں گزارے گا؟ اچھی حالت میں یا بری حالت میں؟ اگر اچھی حالت میں تو کون سے اعمال صالحہ کے بدلے میں اور اگر بری حالت میں تو کون سے برے اعمال کی سزا میں؟ ظاہر ہے کہ انسانی جسم میں داخل ہونے سے پہلے یہ روح حیوانی، نباتی یا جمادی جسم میں تھی اور یہ سب عقل و شعور سے عاری ہیں۔ ان کے اعمال اچھائی یا برائی سے متصف نہیں ہو سکتے۔

اگر کہا جائے کہ اچھی بری حالت میں ان اعمال کی جزا و سزا ہے جو انہوں نے حیوانی اور نباتی وغیرہ جسم میں داخل ہونے سے پہلے انسانی جسم میں کئے تھے، تو اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ارواح کو جو اتنا عرصہ اشرف المخلوقات کی بجائے ادنیٰ درجے کی مخلوق میں رکھا گیا تو کیا یہ سزا کے طور پر رکھا گیا، یا ویسے ہی بلاوجہ رکھا گیا؟ ظاہر ہے کہ بلاوجہ ان ارواح کو اعلیٰ مرتبے سے ہٹا کر ادنیٰ مرتبہ میں رکھنا غلط ہے، کیونکہ بلاوجہ کسی کا بلند مرتبہ چھین لینا ظلم ہے۔

اور اگر سزا کے طور پر رکھا گیا، تو ان کے برے اعمال کی سزا ان کو مل چکی ہے۔ دوبارہ انسانی حالت میں جزا و سزا کس طرح صحیح ہو سکتی ہے؟ ایک دفعہ سزا سے

چھوٹنے کے بعد بار بار تو سزا نہیں ملا کرتی ---- چنانچہ مندرجہ بالا سات قطعی دلائل سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ اس دنیا کو دار الجزا اقرار دینا اور تناسخ یا آواگون (Metempsychosis) کا عقیدہ رکھنا قطعاً غلط ہے۔ لازماً اس دنیا کے علاوہ کوئی اور جہان ماننا پڑے گا جس میں جزا و سزا ہو، جس طرح اسلام نے تسلیم کیا ہے اور اس کی مفصل کیفیت بیان کی ہے۔ اور دنیا کے مختلف احوال غمی، خوشی، تکلیف اور آرام وغیرہ سابقہ اعمال کی جزا نہیں؛ بلکہ یہ حسن انتظام کا تقاضا ہے کہ ہر رنگ اور ہر کیفیت کا جامع ہو۔ تاکہ ایک حالت کا دوسری حالت سے امتیاز ہو سکے اور اس کی قدر و قیمت معلوم ہو، اگر فقیری نہ ہو تو غنا کی قدر و قیمت کیسے معلوم ہو؟ اگر بیماری نہ ہو تو صحت کی قدر کیسے معلوم ہو؟ اگر بدصورتی نہ ہو تو خوبصورتی کی قدر کیسے معلوم ہو؟ اسی اختلاف و تنوع میں نظام دنیا کا حسن اتم مضمر ہے اور اس نظام کا یہ حسن اتم ہی اس کے منتظم حقیقی کے کمال علم و حکمت کی دلیل ہے۔

۲۹ سوال ۷۴

اعتراضات تو جس طرح عقیدۂ تناسخ پر وارد ہوتے ہیں، اسی طرح اسلامی نقطۂ نظر پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ پھر کس بنا پر اسلامی نقطۂ نظر کو ترجیح دی جائے؟

۲۹ جواب ۷۴

صرف خیالی طور پر اعتراضات کا پیدا ہونا کوئی عیب نہیں؛ البتہ واقعی اور معقول اعتراض کا وارد ہونا باعث عیب و نقص ہے، لیکن آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر پر کئے گئے اعتراضات کس قدر کمزور اور بے بنیاد ہیں؛ البتہ ہم نے اسلام کی طرف سے عقیدۂ تناسخ پر جو اعتراضات کئے ہیں، ان کا جواب اہل تناسخ کبھی نہیں دے سکتے۔ خواہ وہ کتنے ہی جنم میں پلٹ کر آئیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

سوال ۳۰ / ۷۵

اللہ تعالیٰ جنت کے متعلق فرماتا ہے ﴿اُكُلُهَا دَآئِمٌ﴾ [الرعد، آية ۳۵] ﴿اس کے میوے دائمی ہیں﴾ اور اللہ کے سوا جو اشیاء موجود ہیں، سب فنا ہونے والی ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿كُلُّ شَيْئٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ [القصص، آية ۸۸] ﴿اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے﴾ اب اگر جنت کو موجود مانا جائے تو اس آیت کی رو سے اس کا فنا ہونا لازمی ہوگا؛ جبکہ پہلی آیت سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ جنت غیر فانی ہے۔ اس تعارض کو دور کرنے کی کیا صورت ہوگی؟

جواب ۳۰ / ۷۵

درحقیقت ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ آیت ﴿كُلُّ شَيْئٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ [القصص، آية ۸۸] کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ ہر شی آئندہ بروز قیامت ہلاک ہوگی؛ بلکہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہر شی ماسوا اللہ اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم اور باطل محض ہے۔ ذاتی طور پر موجود صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔ جیسے کوئی شخص کہے کہ چاند ایک سیاہ غیر منور کرہ ہے، تو اس کے یہ معنیٰ ہوتے ہیں کہ اس کا نور عارضی ہے، یعنی سورج کے عکس کی وجہ سے ہے۔ نہ یہ کہ آئندہ سیاہ ہوگا۔ لہٰذا ﴿اُكُلُهَا دَآئِمٌ﴾ [الرعد، آية ۳۵] سے اس آیت کا کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو اگرچہ دائمی وجود بخشا ہے لیکن فی نفسہٖ معدوم و ہلاک ہے، کیونکہ اس کا وجود اور دوام ذاتی نہیں ہے؛ بلکہ محض ارادۂ الٰہی کی وجہ سے ہے۔ اس لئے اس کا وجود ارادۂ الٰہی کی وجہ سے غیر فانی بھی ہے اور ذاتی طور پر معدوم بھی ہے۔

۳۱ سوال ۷۶

جو لوگ جنت یا دوزخ میں داخل ہوں گے، اس کے بعد وہ مریں گے یا ہمیشہ زندہ رہیں گے؟ بصورت ثانیہ ان کو وہاں سے نکالا بھی جائے گا یا وہ اپنی اپنی جگہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے؟

۳۱ جواب ۷۶

ان کے لئے موت نہیں ہے۔ جنت والے ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور دوزخیوں میں جو گنہگار مؤمنین ہوں گے وہ بھی گناہوں کی سزا پاکر یا شفاعت کی وجہ سے آخرکار دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کردیئے جائیں گے؛ البتہ کافر ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ کیونکہ جب کافروں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا، تو ان سے کہا جائے گا۔

﴿فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ [النحل، آیة ۲۹]

﴿پس داخل ہوجاؤ جہنم کے دروازوں میں ہمیشہ کے لئے﴾

اسی طرح دوزخ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

﴿لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى﴾ [طٰہٰ، آیة ۷۴ ، الاعلیٰ، آیة ۱۳]

﴿دوزخی نہ تو دوزخ میں مرے گا اور نہ اس کو عیش و آرام کی زندگی میسر ہوگی﴾

اور جنتیوں کے بارے میں فرماتا ہے

﴿وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ٥﴾ [الحجر، آیة ۴۸]

﴿اور وہ لوگ جنت سے کبھی نکالے نہ جائیں گے۔﴾

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جنتی اور جہنمی ہمیشہ جنت اور جہنم میں رہیں گے۔

۳۲ سوال ۷۷

اللہ تعالیٰ جنت والوں کے متعلق فرماتا ہے۔

﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ.﴾ [هود، آية ١٠٨]

﴿اور جو لوگ نیک بخت ہوں گے تو وہ بہشت میں ہوں گے، جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں﴾

اور دوزخ والوں کے بارے میں فرماتا ہے

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّشَهِیْقٌ ○ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ.﴾ [هود، آية ١٠٦، ١٠٧]

﴿اور جو لوگ بد بخت ہوں گے، وہ دوزخ میں ہوں گے اور وہاں ان کو چیخنا اور چلانا ہوگا اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین موجود ہیں۔﴾

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنت والے جنت میں اور جہنم والے جہنم میں زمین و آسمان کے قائم رہنے تک رہیں گے۔ اور اسلامی نظریہ کے لحاظ سے زمین و آسمان کا زمانہ محدود ہے، آخر کار یہ فنا ہو جائیں گے۔ اس لحاظ سے جنت و دوزخ میں رہنے کا زمانہ بھی محدود ہونا چاہیے؟

٣٢ جواب ٧٧

پہلی آیت میں اَرْض سے مراد جنت کی فرحت بخش زمین اور سَمٰوٰت سے مراد وہاں کی خوشگوار فضائیں ہیں۔ اسی طرح دوسری آیت میں اَرْض سے مراد جہنم کی تپتی ہوئی زمین اور سَمٰوٰت سے مراد وہاں کی مسموم فضائیں ہیں، نہ کہ دنیا کی زمین و آسمان۔ اور ظاہر ہے کہ جب جنت اور دوزخ دائمی ہیں تو ان کی زمینیں اور فضائیں بھی دائمی ہونگی۔

اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سماوات وارض سے مراد دنیاوی آسمان اور زمین ہیں، تو پھر بھی ہمارے مدعا پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ ''جب تک آسمان و زمین قائم رہیں گے'' سے مراد کسی محدود زمانے کا تعین نہیں ہوتا؛ بلکہ محاورے کے اعتبار سے اس سے مراد بھی دوام ہی ہوتا ہے۔ یعنی ابد تک۔

۳۳ سوال ۷۸

جو کافر یا مسلمان جہنم و جنت میں داخل ہوں گے، ان کو جہنم یا جنت میں ہمیشہ کے لئے کیوں رکھا جاتا ہے؟ کیا اس لئے کہ جہنم یا جنت ان کے اعمال کا ثمرہ ہے؟ لیکن ان کے اعمال تو محدود زمانہ تک ہوتے ہیں، لہٰذا ان کو سزا و جزا بھی محدود ہونی چاہئے کیونکہ ثمرہ اصل کے تابع ہوتا ہے۔ یہ بات عقل سے بعید ہے کہ کوئی انسان کفر یا نیکی تو کرے مثلاً سو سال اور اس کی سزا یا انعام کا زمانہ لامحدود ہو؟

۳۳ جواب ۷۸

یہی اعتراض ستیارتھ پرکاش میں آریوں [1] کے مرشد اعظم نے اسلامی قانون سزا و جزا پر کیا ہے۔ لیکن واقعہ میں یہ اعتراض بہت مہمل (بے کار) ہے۔ کیونکہ

---

[1] ← ''آریوں'' سے مراد ہندو مذہب کا وہ فرقہ ہے جسے آریہ سماج کہا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد سوامی دیانند نے ۱۸۷۵ء میں رکھی تھی۔ اس کے پیروکار عام ہندوؤں کی طرح بت پرستی کے قائل نہیں۔ اس فرقے نے ہندوؤں میں بہت سی مذہبی اور سماجی اصلاحات کیں۔ نکاحِ بیوگان کا حامی اور کم سنی کی شادیوں کا مخالف ہے۔ لیکن اس فرقے کے پیروکار اسلام کے سخت خلاف تھے اور ایک زمانے میں انہوں نے اسلامی عقائد کے رد میں متعدد کتابیں لکھی تھیں جن میں ایک کتاب ستیارتھ پرکاش بھی تھی، جس کے مصنف نے اسلام کے قانون جزا و سزا پر بہت اعتراضات کئے تھے۔

ثمرہ کا اصل کے تابع ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جتنا زمانہ اصل کا ہو، اتنا ہی زمانہ ثمرہ کا ہو۔ ورنہ ضروری ہوگا کہ جتنی عمر میں باپ مرا ہو، اتنی ہی عمر میں اس کے بیٹے کی عمر ختم ہو جائے۔ حالانکہ تجربہ شاہد ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ باپ جوانی میں مر جاتا ہے اور اس کی اولاد خوب ضعیف العمر ہو کر مرتی ہے۔ بعض موقع پر ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کے ساتھ قلیل وقت میں نیکی کرتا ہے، جو منٹوں تک محدود ہوتی ہے، مگر اس کا اثر اس وفادار بھائی کے دل میں تازندگی باقی رہتا ہے۔ ایسے ہی بدی اور برائی بھی منٹوں میں ہوتی ہے اور اس کا اثر تاحیات رہتا ہے۔ بادشاہوں کے بعض ملازمین جب بعض نازک مواقع پر اپنی وفاداری کا کوئی غیر معمولی ثبوت دے دیتے ہیں تو بادشاہ خوش ہو کر ان کو انعام کے طور پر کوئی جاگیر وغیرہ عنایت کر دیتے ہیں، جس سے سالہا سال تک وہ اور ان کے پس ماندگان مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ ویسے ہی کئی برے اعمال اور جرم منٹوں میں انسان سے سرزد ہوتے ہیں، لیکن ان کی پاداش کئی سالوں؛ بلکہ تازندگی بھگتنی پڑتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ زمانہ کے لحاظ سے عمل کا ثمرہ عمل کے تابع ہوتا ہے، یعنی جیسے کہ محدود زمانہ عمل میں صرف ہوا ہے، اسی طرح جزاء وسزا کا زمانہ بھی محدود ہو، قطعاً غلط ہے۔

۳۴ سوال ۷۹

جنت میں سب سے بڑی نعمت کیا ہوگی؟

۳۴ جواب ۷۹

جنت میں سب سے بڑی نعمت اللہ کا دیدار ہوگا۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہوں گے۔ تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا تم کو اور کچھ بھی چاہیے؟ وہ لوگ کہیں گے کہ تعجب ہے، اللہ تعالیٰ سے بھلا ہم اور کیا

چاہیں؛ جبکہ اس نے ہمارے چہروں کو منور کر دیا ہے اور جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا حجاب اٹھ جائے گا اور سب لوگ اللہ پاک کے دیدار سے مشرف ہو کر ایسے خوش ہوں گے کہ اس سے بہتر نعمت ان کے نزدیک اور کوئی نہ ہوگی۔

۳۵ سوال ۸۰

اللہ تعالیٰ کا دیدار کیسے ممکن ہے؟ اس لئے کہ آنکھیں اس چیز کو دیکھ سکتی ہیں، جو جسم ہو اور آنکھوں کے سامنے کسی جگہ میں ہو، اور اللہ تعالیٰ نہ تو جسم ہے اور نہ کسی مکان میں متمکن ہونا اس کے لئے ممکن ہے، جیسا کہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ سارے مکانوں سے پاک اور بالاتر ہے۔

علاوہ ازیں جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اس کے دیدار کے متعلق درخواست کی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا

﴿لَنْ تَرَانِیْ﴾ [الاعراف، آیۃ ۱۴۳]

﴿تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکو گے﴾

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنا انسان کے لئے ناممکن ہے۔

اسی طرح دوسری جگہ اللہ پاک اپنی شان میں فرماتا ہے

﴿لَاتُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ o﴾ [الانعام، آیۃ ۱۰۳]

﴿اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے اور وہ لطیف اور خبردار ہے﴾

اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ آنکھیں اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتیں؟

﴿۳۵﴾ جواب ﴿۸۰﴾

یہ تمام دلائل اس مادی دنیا کے لحاظ سے تو صحیح ہو سکتے ہیں کیونکہ جب ہم اس عالم مادی میں کوئی چیز دیکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ کوئی جسم کثیف ہو اور کسی مکان میں آنکھوں کے سامنے ہو۔ لیکن اس پر قیاس کر کے اُس روحانی عالم میں ان شروط کو ضروری قرار دینا صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ اِس عالم میں مادیت اور کثافت غالب ہے اور اُس عالم میں روحانیت اور لطافت غالب ہے۔ اور جتنی کوئی چیز کثیف ہو، اتنی ہی کمزور اور ضعیف ہوتی ہے اور اس سے فائدہ بہت شروط پر موقوف ہوتا ہے اور جتنی کوئی چیز لطیف ہوتی ہے، اتنی ہی وہ زیادہ قوی اور تیز ہوتی ہے۔ جیسے کہ مٹی سے پانی کی قوت اور پانی سے ہوا کی اور ہوا سے آگ کی اور آگ سے بجلی کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا بنسبت اِس عالم مادی کے، اُس روحانی اور لطیف عالم میں حواس بہت تیز اور صحیح ہو جائیں گے۔ جیسے کہ چمگادڑ ضعفِ بصارت کی وجہ سے سورج کو دیکھنے سے عاجز ہے اور ظلمت کا خواہش مند ہے، ویسے ہی اس عالم مادی کے حواس بوجہ کمزوری، لطیف اشیاء؛ خصوصاً اللہ تعالیٰ کو دیکھنے سے عاجز ہیں اور مادی اشیاء کے دیکھنے سے مانوس ہیں، اور جب اُس روحانی عالم میں یہ مادی ضعف دور ہو جائے گا اور روحانی قوت نہایت تیز ہو جائے گی، جیسے کہ قرآن پاک میں وارد ہے

﴿فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ [ق، آیۃ ۲۲]

﴿پس آج تمہاری نگاہ تیز ہے﴾

تو سب لطیف اشیاء جن کے دیکھنے سے مادی آنکھیں عاجز ہیں، عام طور پر نظر آنے لگیں گی۔

اِس عالمِ مادی میں بھی جن لوگوں کی روحانی قوت بڑھ جاتی ہے اور مادی

آثار قریباً مٹ جاتے ہیں، وہ روحانی اشیاء کو دیکھ سکتے ہیں۔ جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے سچے متبعین اولیائے کرامؒ ملائکہ اور دیگر لطیف اشیاء کا بخوبی مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور جس کسی کے مادی آثار بالکل فنا اور نیست و نابود ہو جائیں اور وہ اپنے غلبۂ روحانیت اور لطافت کی وجہ سے عالم روحانی میں جا سکے، وہ اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے بھی دیکھ سکتا ہے اور یہ انتہائی نقطۂ ترقی ہے، جس سے بڑھ کر اور ترقی ناممکن ہے۔ لیکن یہ شرف اسی ذات کو حاصل ہو سکتا ہے، جو سب کمالات کی جامع اور خاتم ہو اور یہ پاک ذات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ہے۔ آپ کو شبِ معراج میں اللہ تعالیٰ نے اس انتہائی ترقی اور اعلیٰ منصب سے جو دوسروں کے لئے ناممکن تھا، سرفراز فرمایا اور قُربِ قابَ قوسین سے بھی زیادہ قرب سے مشرف فرمایا، جیسے کہ جمہور کا عقیدہ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چونکہ اس مادی عالم میں، ان مادی آنکھوں سے خدا کو دیکھنا چاہا تھا۔ اس لئے حکم ہوا کہ تم نہیں دیکھ سکتے، اور پھر ان کی تسکین کی خاطر اس طرح سمجھا دیا گیا کہ پہاڑ جو مادیت کے لحاظ سے نہایت قوی اور مستحکم ہے، ہم اس پر اپنی تجلی کا ظہور کرتے ہیں، پھر جیسے اس کا حال ہوا، تم بھی اپنے کو اس پر قیاس کر کے اپنی کمزوری اور عدم برداشت کا یقین کر لینا۔ جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام اس عجیب کیفیت کے دیکھنے سے مرعوب ہو کر بے ہوشی کے عالم میں گر پڑے۔ جب ہوش میں آئے تو اپنی کمزوری اور عدم برداشت کا اعتراف کیا۔ لہٰذا آیتِ مذکورہ سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ عالم آخرت میں بھی خدا تعالیٰ کا دیدار ناممکن ہے۔ اور یہی دوسری آیت کا بھی مطلب ہے کہ یہ کثیف مادی آنکھیں اللہ تعالیٰ کو اس کی لطافت کے سبب نہیں دیکھ سکتیں اور وہ ان کو دیکھ سکتا ہے۔ عالم آخرت میں بھی جو لوگ ظلمانی عقائد میں محبوس ہوں گے اور خدا پرستی کے نور سے

بالکل بے بہرہ ہوں گے جیسے کہ کفار، ان کی آنکھیں اللہ تعالیٰ کے دیکھنے سے محجوب ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ [المطففين، آية ١٥]

﴿حق یہ ہے کہ کفار قیامت کے دن اپنے رب کے دیدار سے محروم و محجوب ہوں گے﴾

اور جن لوگوں کے پاس خدا پرستی کا نور ہوگا، فقط وہی لوگ اس کے دیدار سے مشرف ہوں گے، جیسے اہل ایمان۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾[القيامة، آية ٢٢]

﴿کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے﴾

اور دوسری جگہ فرماتا ہے۔

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ط﴾[يونس، آية ٢٦]

﴿جن لوگوں نے دنیا میں بھلائی کے کام کیے ان کے لئے بھلائی بھی ہے اور اس سے زیادہ بھی ہے﴾

حضور ﷺ سے بسندِ صحیح اس آیت کی تفسیر میں یہی مروی ہے کہ زِيَادَةٌ سے مراد دیدارِ الٰہی ہے۔ علاوہ ازیں کفار کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

﴿كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ﴾ [المطففين، آية ١٥]

یعنی حق یہ ہے کہ کفار بروز قیامت اپنے رب کے دیدار سے محجوب ہوں گے۔ اگر مؤمن بھی اللہ تعالیٰ کے دیدار سے اس دن محجوب ہوتے تو پھر کفار کی تخصیص اس آیت میں نہ کی جاتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دن مؤمن خدا کے دیدار سے

ضرور مشرف ہوں گے۔

ان آیات کے علاوہ بہت سی احادیث بھی صحیح بخاری اور مسلم ① وغیرہ میں موجود ہیں جن سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اہل ایمان کو جنت میں دیدار الٰہی نصیب ہوگا۔

بعض حضرات جن کی عقل مادیت پرستی میں منہمک ہو جانے کی وجہ سے غیر مادی احوال سے بالکل غیر مانوس اور گھبراتی ہے، وہ خواہ مخواہ ان آیات کی مہمل تاویلات کرتے رہتے ہیں۔ افسوس اگر وہ اس مادیت پرستی کو ترک کر کے روحانی اصلاح کی جانب متوجہ ہوتے تو ان کی گھبراہٹ دور ہو جاتی اور نہایت فراخدلی سے ایسے لطیف اور باریک امور کو تسلیم اور قبول کرتے۔ اللہ تعالیٰ ان کے حال پر رحم فرمائے۔ (آمین)

۳۶ سوال ۸۱

جنت میں جو لوگ ہوں گے، وہ کچھ کھائیں پیئیں گے یا نہیں؟ اگر نہیں تو وہ

---

① ← صحیح بخاری و مسلم کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

بخاری

صحیح بخاری احادیث رسول اللہ ﷺ کا سب سے مستند مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب کرنے والے محمد بن اسماعیل الملقب بہ امام بخاری (۱۹۴ھ تا ۲۵۶ھ) ہیں۔ اس میں ۷۲۷۵ حدیثیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب، یعنی قرآن مجید کے بعد اسلامی لٹریچر میں سب سے زیادہ صحیح اسی کتاب کو سمجھا جاتا ہے۔

مسلم

صحیح مسلم کو مسلم بن حجاج قشیری (۲۰۶ تا ۲۶۱ھ) نے تالیف کیا۔ صحیح بخاری کے بعد احادیث کی صحیح ترین کتاب ہے۔ اس میں ۴۸۰۰ حدیثیں ہیں۔

زندگی کیسے گزاریں گے اور بصورت اولیٰ غذا کے فضلات (پاخانہ، پیشاب وغیرہ) سے جنت میں غلاظت نہیں ہوجائے گی؟

۳۶ جواب ۸۱

جنتی لوگ کھائیں گے بھی اور پیئیں گے بھی لیکن وہاں کے کھانے پینے کی چیزیں یہاں کی اشیاء کی طرح نہ ہوں گی؛ بلکہ وہ نہایت لطیف اور پاکیزہ ہوں گی، جو ہضم ہونے کے بعد انسان کے جسم سے ڈکار اور پسینہ کی شکل میں نکل کر اڑ جائیں گی۔ پاخانہ وغیرہ غلیظ مواد پیدا نہ ہوں گے۔ جیسے اس حدیث شریف سے صاف ظاہر ہے۔

﴿عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم : اِنَّ اَھْلَ الْجَنَّۃِ یَاْکُلُوْنَ فِیْھَا وَیَشْرَبُوْنَ وَلَا یَتْفُلُوْنَ وَلَا یَبُوْلُوْنَ وَلَا یَتَغَوَّطُوْنَ وَلَا یَمْتَخِطُوْنَ. قَالُوْا : فَمَا بَالُ الطَّعَامِ؟ قَالَ : جُشَاءٌ وَّرَشْحٌ کَرَشْحِ الْمِسْکِ، یُلْھَمُوْنَ التَّسْبِیْحَ وَالتَّحْمِیْدَ کَمَا تُلْھَمُوْنَ النَّفَسَ﴾ (رواہ مسلم، مشکوۃ شریف ص۴۹۶ مطبوعہ نور محمد)

[حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جنتی جنت میں کھائیں گے اور پیئیں گے، لیکن نہ تھوکیں گے، نہ پیشاب کریں گے، نہ پاخانہ کریں گے اور نہ رینٹھ سنکیں گے۔'' صحابہؓ نے عرض کی ''کھانے کا فضلہ کیا ہوگا؟'' فرمایا ''ڈکار ہوجائے گا اور پسینہ مشک کی خوشبو کی مانند اور سبحان اللہ اور الحمدللہ کہنا جنتیوں کے دل میں ڈال دیا جائے گا اور وہ اس طرح ان کی زبان پر رواں ہوگا جیسے تمہاری سانس جاری رہتی ہے۔]

۳۷ سوال ۸۲

جنت میں جو لوگ داخل ہوں گے، ان کی عمریں وہی ہوں گی جو ان کے مرنے کے وقت تھیں، یا سب ایک عمر کے ہوں گے؟

۳۷ جواب ۸۲

جنت میں سب لوگ ایک ہی عمر میں ہوں گے۔ ان میں نہ کوئی بوڑھا ہوگا نہ بچہ۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاح کے طور پر ایک بوڑھی عورت سے فرمایا کہ بوڑھی عورتیں جنت میں داخل نہیں ہوں گی۔ آپ کا یہ ارشاد سن کر

بڑھیا بہت گھبرا گئی تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم قرآن مجید نہیں پڑھتیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

﴿اِنَّآ اَنۡشَاۡنٰھُنَّ اِنۡشَآءً ۝ فَجَعَلۡنٰھُنَّ اَبۡکَارًا ۝﴾ [الواقعة، آية ۳۵،۳۶]

﴿بے شک ہم ان کو کنواری حالت میں پیدا کریں گے۔﴾

۳۸ سوال ۸۳

جنت میں سب لوگ ایک جیسے عیش و آرام میں ہوں گے یا ان میں فرق ہوگا؟ پہلی صورت میں فرق مراتب ختم ہو جائے گا۔ کم اعمال اور زیادہ اعمال والے سب مساوی ہو جائیں گے اور یہ خلاف انصاف ہے، کیونکہ اعمال کی کمی وبیشی کے لحاظ سے ثمرہ کی کمی وبیشی ضروری ہے۔ اور دوسری صورت میں وہاں بھی دنیا کی طرح حسرت رہے گی۔ ادنیٰ مرتبے والا اعلیٰ مرتبے والے کی حالت دیکھ کر اپنی بے وقعتی سے ضرور غمگین رہے گا۔ حالانکہ جنت میں اسلامی نظریئے کے مطابق ہر طرح خوشی ہے، کسی قسم کے غم کا نام بھی نہیں ہے؟

۳۸ جواب ۸۳

بے شک جنت میں فرق مراتب ہوگا لیکن ادنیٰ مرتبے والا اپنی ہی حالت پر خوش اور مسرور رہے گا۔ اور یہ کوئی بعید بات نہیں ہے۔ اس دارِ دنیا میں بھی ادنیٰ مرتبے کے لوگ بعض مواقع پر اپنی کم رتبگی کے باوجود خوشی میں ایسے مستغرق ہوتے ہیں کہ وہ اپنی حالت کے سوا سارے جہان کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿کُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡھِمۡ فَرِحُوۡنَ ۝﴾ [المؤمنون، آية ۵۳، الروم، آية ۳۲]

﴿ہر گروہ اپنی موجودہ حالت پر خوش و فرحان ہے﴾

تو جیسے یہاں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے، ویسے وہاں ہمیشہ رہے گا۔

علاوہ ازیں یہ دارِ دنیا اختلاف وعناد کی جگہ ہے اس لئے یہاں دوسرے کی اعلیٰ حالت دیکھ کر غم پیدا ہوتا ہے اور جنت تو دارِ محبت واتحاد ہے اس لئے جنت میں ایسا نہ ہوگا۔

۳۹ سوال ۸۴

جنت میں مرض اور بیماری بھی ہوگی یا ہمیشہ تندرستی رہے گی؟ اگر مرض ہو تو وہاں بھی دنیا کی طرح پریشانی رہے گی، حالانکہ اسلامی تعلیم کی رو سے وہاں کوئی غم اور پریشانی

نہیں ہوگی؟ اور اگر ہمیشہ تندرستی ہی رہے، مرض کبھی لاحق ہی نہ ہو، تو پھر تندرستی کی قدر کیسے ہوگی؟ جب ان کے خیال میں مرض کا وجود ہی نہ ہوگا، تو وہ تندرستی کو نعمت کیسے تصور کریں گے؟ اسی طرح ہر ایک خوشی اور نعمت کا حال سمجھ لیجئے، جب تک خوشی اور نعمت کے مقابلے میں ان کی نقیض اور ضد نہ ہو، تو وہ نعمت اور خوشی قابل قدر نہیں ہو سکتی؟

۳۹ جواب ۸۴

بے شک جب تک ہر خوشی کے مقابلہ میں اس کی نقیض یا کوئی مصیبت ذہن میں نہ ہو تو اس خوشی کا مزہ مکمل طور پر حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اہل جنت سے یہ دار دنیا، جس میں کوئی بھی ذی عقل انسان کسی نہ کسی فکر و غم سے خالی نہیں رہ سکتا، فراموش نہ ہوگی؛ بلکہ اس کا نقشہ ان کے ذہن میں ضرور رہے گا اور جب وہ اس عالم آخرت کی خوبیوں کا، اس دار دنیا کے مصائب سے مقابلہ کریں گے تو ضرور ان کو خوشی و مسرت بے حد حاصل ہوگی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کا شکریہ اپنے کلام میں یوں بیان فرماتا ہے

﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ﴾ [فاطر، آیۃ ۳۴]

﴿یعنی یہ لوگ نعمتیں پا کر کہیں گے کہ اللہ کا شکر ہے، جس نے ہر طرح کا رنج و غم ہم سے دور کر دیا۔ بے شک ہمارا پروردگار بخشنے والا، بڑا قدردان ہے۔﴾

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جنت کی نعمتیں نصیب فرمائے اور قبر و جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھے۔ آمین

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّار.

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنِ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنِ، وَ عَلٰی اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْن.

تمّت

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔
فون :7352332، 7232336 فیکس: 7223584
www.ilmoirfanpublishers.com
E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com